قلندر شعور

خواجہ شمس الدین عظیمی

قلندر شعور

خواجہ شمس الدین عظیمی

مکتبہ روحانی ڈائجسٹ

باراول مئی ۱۹۸۶ ـــــــ ۲۰۰۰

باردوم نومبر ۱۹۸۶ ـــــــ ۲۰۰۰

بارسوم نومبر ۱۹۸۷ ـــــــ ۱۰۰۰

بارچہارم جولائی ۱۹۸۸ ـــــــ ۱۰۰۰

عظیمی پرنٹرز ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸ فون ۶۲۶۴۳۳

اچھی ہے بُری ہے دہر فریاد نہ کر
جو کچھ کہ گزر گیا اُسے یاد نہ کر
دو چار نفس عُمر ملی ہے تجھ کو
دو چار نفس عُمر کو برباد نہ کر

(قلندر بابا اولیاءؒ)

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ نے اپنے ذہن میں موجود کائناتی پروگرام کو شکل وصورت کے ساتھ وجود میں لانا چاہا تو کہا "کُن"۔ تو اللہ کے ذہن میں کائناتی پروگرام ایک ترتیب اور تدوین کے ساتھ اس طرح وجود میں آگیا ———

- ایک کتاب المبین
- ایک کتاب المبین میں تیس کروڑ لوحِ محفوظ
- ایک لوحِ محفوظ میں اسّی ہزار حضیرے
- ایک حضیرے میں ایک کھرب سے زیادہ مستقل آباد نظام اور بارہ کھرب غیر مستقل نظام
- ایک نظام کسی ایک سورج کا دائرۂ وسعت ہوتا ہے۔ ہر سورج (STAR) کے گرد نو۹، بارہ۱۲ یا تیرہ۱۳ سیّارے گردش کرتے ہیں۔

یہ محض قیاس آرائی ہے کہ انسانوں کی آبادی صرف زمین (ہمارے نظامِ شمسی) میں پائی جاتی ہے۔ انسانوں اور جنّات کی آبادیاں ہر حضیرے پر موجود ہیں۔ ہر آبادی میں زندگی کی طرزیں اسی طرح قائم ہیں جس طرح زمین پر موجود ہیں۔ بھوک، پیاس، خواب، بیداری، محبت، غصّہ، جنس، افزائش نسل، وغیرہ وغیرہ زندگی کا ہر تقاضا، ہر جذبہ اور ہر طرز ہر سیّارہ میں جاری وساری ہے۔

ایک حضیرے پر ایک کھرب سے زیادہ آباد نظام واقع ہیں۔ ایک آباد نظام کو قائم رکھنے کے لئے غیر مستقل نظام اسٹور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غیر مستقل نظام سے مراد یہ ہے کہ پورے پورے نظام بنتے اور ٹوٹ جاتے ہیں اور اس ٹوٹ پھوٹ سے آباد مستقل نظام فیڈ (FEED) ہوتے رہتے ہیں۔ ہر نظام میں الگ الگ سماوات، ارض، جبال، حیوانات، جمادات، نباتات وغیرہ اسی طرح موجود ہیں جس طرح ہم اپنے نظام میں دیکھتے ہیں۔

اللہ نے جب انسان اور جنات کو اپنی محبت کے ساتھ پیدا کیا تو اس کے رہنے کے لئے جنّت کو اپنا پسندیدہ مقام قرار دیا۔ اور کہا۔ "اے آدم! تو اپنی بیوی کے ساتھ جنّت میں قیام کر اور جہاں سے دل چاہے خوش ہو کر جنّت کی نعمتوں سے اپنی بھوک رفع کر۔ اور اپنی پیاس بجھا۔ اور دیکھ اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تیرا شمار ظالموں میں ہوگا۔

حقیقت کی زندگی گزارنے کی ترغیب دینے اور دوزخ سے بچنے کی تلقین کے لئے دنیا میں اب تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آچکے ہیں۔ اور ان پیغمبروں کی تعلیمات کو پھیلانے کے لئے ان کے وراثت یافتہ دوست آتے رہے ہیں۔ اور آتے رہیں گے۔ یہ تمام بزرگ، اوتار اور اولیاء اللہ اپنے اپنے ماحول اور ماحول میں رائج زبان کے مطابق وحدانیت کا پرچار کرتے رہے کہ اللہ ایک ہے، یکتا ہے، بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ اس کا کوئی خاندان ہے۔ اسی وحدت اور وحدانیت پر ہر مذہب نے راگ الاپا ہے۔ زمین پر کسی ایسے مذہب کا وجود نہیں ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے وجود سے

انکار کیا ہو۔ اللہ کے دوستوں نے احدیت، صمدیت، حقانیت اور وحدانیت کو سمجھانے اور سمجھنے کے لئے مختلف راستے اور طریقے بتائے ہیں۔

معرفت کی مشعل

قدرت اپنے پیغام کو پہنچانے کے لئے دیے سے دیا جلاتی رہتی ہے۔ معرفت کی مشعل ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ صوفی، ولی، غوث، قطب، مجذوب، اوتار، قلندر، ابدال قدرت کے وہ ہاتھ ہیں جن میں روشنی کی مشعل روشن ہے۔ یہ پاکیزہ لوگ اس روشنی سے اپنی ذات کو بھی روشن رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی روشنی کا انعکاس دیتے ہیں۔ صرف تاریخ کے اوراق ہی نہیں، لوگوں کے دلوں پر بھی ان بزرگوں کی داستانیں اور چشم دید واقعات زندہ اور محفوظ ہیں۔ اُن کی دعاؤں سے مُردوں کو زندگی، بیماروں کو شفا، بھوکوں کو غذا، غریبوں کو زر، بے حال لوگوں کو بال و پر، بے سہارا اور بے کس لوگوں کو اولاد اور مال و متاع کے انعامات ملتے رہتے ہیں۔

قلندر کا مقام

ان بندوں میں سے جو بندے قلندر ہوتے ہیں وہ زمان و مکان (TIME AND SPACE) کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں اور سارے ذی رُوح اس کے ماتحت کر دیے جاتے ہیں۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ ان کے تابعِ فرماں ہوتا ہے۔ لیکن اللہ کے یہ نیک بندے غرض، طمع، حرص اور لالچ سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ مخلوق جب ان کی خدمت میں کوئی گزارش پیش کرتی ہے تو وہ اس کو سنتے بھی ہیں اور اُس کا تدارک بھی کرتے ہیں۔ کیوں کہ قدرت نے انہیں اسی کام کے لئے مقرر کیا ہے۔ یہی

وہ پاکیزہ بندے ہیں جن کے بارے میں اللہ کہتا ہے:

"میں اپنے بندوں کو دوست رکھتا ہوں اور ان کے کان، آنکھ اور زبان بن جاتا ہوں۔ پھر وہ میرے ذریعے بولتے ہیں، میرے ذریعے سنتے ہیں اور میرے ذریعے چیزیں پکڑتے ہیں۔"

ان ازلی سعید بندوں کی تعلیمات یہ ہیں کہ ہر بندہ کا اللہ کے ساتھ محبوبیت کا رشتہ قائم ہے، ایسی محبوبیت کا رشتہ جس میں بندہ اپنے اللہ کے ساتھ راز و نیاز کرتا ہے۔

جسم اور رُوح

جب ہم زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک ہی حقیقت آتی ہے کہ آدم کا ہر بیٹا اور حوّا کی ہر بیٹی خوش رہ کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ لیکن زندگی کا مادّی نظریہ ہر ہر قدم پر انہیں مایوس کرتا ہے اس لئے کہ ہماری زندگی کا ہر ہر لمحہ فانی اور متغیر ہے۔ مادّی اعتبار سے ہمیں یہ بھی علم نہیں ہے کہ سچی خوشی کیا ہوتی ہے اور کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ حقیقی مسرت سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی اصل بنیاد (BASE) کو تلاش کریں۔

جب ہم کچھ نہیں تھے تو کچھ نہ کچھ ضرور تھے۔ اس لئے کہ کچھ نہ ہونا ہمارے وجود کی نفی کرتا ہے۔ ہماری مادّی زندگی ماں کے پیٹ سے شروع ہوتی ہے اور یہ مادّہ جب ایک خاص پروسس (PROCESS) سے گزر کر اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو ایک جیتی جاگتی تصویر عدم سے وجود میں آجاتی ہے۔ ماحول سے اس تصویر کو ایسی تربیت ملتی ہے کہ اُسے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ سچی خوشی حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ اور کس طرح یہ سچّی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

حقیقی مسرت سے ہم آغوش ہونے کے لئے انسان کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہئیے کہ زندگی کا دارومدار صرف جسم پر نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر ہے کہ جس حقیقت نے خود اپنے لئے جسم کو لباس بنالیا ہے۔ پیدائش کے بعد زندگی کا دوسرا مرحلہ ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ ہمارا ہر ہر لمحہ مرتا رہتا ہے اور ہر لمحے کی موت دوسرے لمحے کی پیدائش کا ذریعہ بن رہی ہے۔ یہی لمحہ کبھی بچپن ہوتا ہے، کبھی لڑکپن، کبھی جوانی اور کبھی بڑھاپے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

جیتی جاگتی تصویر

ہم اس حقیقت تک رسائی اس طرح حاصل کرسکتے ہیں کہ ہم یہ جان لیں کہ جیتی جاگتی تصویر ایک جسم نہیں ہے بلکہ ایک شعور ہے۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم اسے بالکل شعور بھی نہیں کہہ سکتے کیوں کہ شعور صرف ہماری پہچان کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے اوپر ساری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جسم کے ختم ہونے پر مادّی کثافت اور آلودگی ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ جسم کے ختم ہونے کے بعد شعور فنا نہیں ہوتا بلکہ شعور کسی دوسرے عالم میں منتقل ہوجاتا ہے۔

جتنی آسمانی کتابیں ہیں، ان سب میں ایک ہی بات کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی صرف مادّی جسم نہیں ہے بلکہ ایک شعور ہے۔ ہم جب پیدائش سے موت تک کی زندگی کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ جان لیتے ہیں کہ جس شعور کی بنیاد ماں کے پیٹ میں پڑی تھی وہ شعور ایک طرف گھٹتا رہتا ہے اور دوسری طرف بڑھتا رہتا ہے۔ جیسے جیسے شعور گھٹتا ہے آدمی ماضی میں جاتا رہتا ہے اور جیسے جیسے شعور بڑھتا ہے آدمی مستقبل میں قدم رکھتا رہتا ہے۔ شعور کا گھٹنا اور بڑھنا عمر کا تعیّن کرتا ہے۔ شعور کے ایک زمانے کو "بچپن" کہتے ہیں۔ شعور کے دوسرے زمانے کو "جوانی" اور شعور کے تیسرے زمانے کو "بڑھاپا"۔ بالآخر جو شعور اس مادّی زندگی کو قائم رکھے ہوئے ہے اور جس شعور پر یہ جسم ارتقائی منازل طے کررہا ہے وہ قائم رہتا ہے۔

ذات کا مطالعہ

ہم جب اپنے آپ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک محدود اور فنا ہونے والا جسم ہے اور یہی ہماری زندگی کی پہچان ہے۔ یہ جسم جو ہمیں نظر آتا ہے اس کے اجزائے ترکیبی کثافت، گندگی، تعفن اور سڑاند ہیں۔ اس سڑاند کی بنیاد اس نظریے پر قائم ہے کہ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں مادہ ہوں اور میں اس مادی دنیا کی پیدائش ہوں۔ یہ محدود نظریہ ہر آدمی کو کسی ایک مقام میں محدود کر دیتا ہے اور ہر آدمی ایک محدودیت کے تانے بانے میں خود کو گرفتار کر لیتا ہے اور اس طرح محدود اور پابند نظریے کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ زمین پر بسنے والا ہر آدمی جب اپنا تذکرہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، میں ہندو ہوں، میں پارسی ہوں، میں عیسائی ہوں حالاں کہ روح کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ روشنی ہر جگہ روشنی ہے چاہے وہ عرب میں ہو، عجم میں ہو یا یورپ میں ہو یا ایشیا کے کسی حصے میں۔

اللہ کا نظام کچھ اس طرح قائم ہے کہ اس دنیا میں جو اللہ کا پیغام آیا وہ اپنے الفاظ کے ساتھ قائم ہے۔ عیسائیوں کے لئے بائیبل کے الفاظ مذہب کا درجہ رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے قرآن مذہب کا پیش رو ہے۔ ہندو بھگوت گیتا کے الفاظ کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ سب کتابیں دراصل خدا کے برگزیدہ بندوں کی وہ آوازیں ہیں جو روشنی بن کر تمام عالم میں پھیل گئی ہیں۔

ہم جب کائنات کی تخلیق پر غور کرتے ہیں تو بھی ہمیں یہی پتہ چلتا ہے کہ ہماری کائنات اللہ کی آواز ہے۔ اللہ نے جب اپنی آواز میں کُن کہا تو ساری کائنات وجود میں آ گئی۔ خدا جب اپنا تعارف کراتا ہے تو کہتا ہے کہ میں مخلوق کا دوست ہوں۔ جس

طرح ایک باپ اپنے بیٹے کو نہیں بھولتا اسی طرح خدا بھی اپنی مخلوق کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ وہ خدا جو ہمارا رب ہے جو ہمارے لئے ہر طرح کے وسائل پیدا کرتا ہے اور ہمیں زندگی کے نئے نئے مراحل اور نئے نئے تجربات سے گزارتا رہتا ہے، بلا شک و شبہ ہمارا دوست ہے

مقدس کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جو انکشافات ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ خدا اپنی مخلوق کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا، چاہے ہمارے جسمانی خد و خال کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ نسلی سلسلے کی طرف جب تفکر کیا جاتا ہے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تخلیق ایک پروگرام کے مطابق عمل میں آ رہی ہے۔ جب ہم "زمین ماں" کے پیٹ میں کوئی بیج ڈالتے ہیں تو وہ بیج نشو و نما پا کر ایک درخت بن جاتا ہے۔ بیج جب زمین کے اندر ڈال دیا جاتا ہے تو وہ زمین سے پانی کو جذب کرتا ہے اور پانی بیج میں موجود ایک سوراخ (MICROPYLE) کے ذریعے بیج کے اندر پہنچ کر سوئے ہوئے بیج (DORMANT SEED) کی نشو و نما کرتا ہے۔ بیج کی دالوں (COTYLEDONS) کے اندر ننھے ننھے پتے اور چھوٹی ڈنڈی میں خلیاتی تقسیم وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ننھے پتے بڑھ کر تنے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ڈنڈی بڑھ کر جڑ بن جاتی ہے۔ جڑ زمین میں داخل ہو کر نہ صرف زمین سے اس نئے پودے کے لئے پانی اور غذا جذب کرتی ہے بلکہ اس پودے کے لئے زمین میں مستقل ٹھہراؤ کا بھی ذریعہ بنتی ہے۔ اس کے برعکس تنا زمین کے مخالف سمت اور روشنی کی جانب بڑھنے لگتا ہے۔ پودے کی ابتدائی عمر میں پودے کی دالیں جو اس نومولود پودے کے لئے غذا کو ذخیرہ کئے ہوتی ہیں، پودے کو غذا فراہم کرتی ہیں۔ جب پودا سورج کی روشنی میں ضیائی تالیف

(PHOTOSYNTHESIS) کے ذریعے خود اپنی غذا تیار کرنے لگتا ہے تو یہ الیں خشک ہو کر ختم ہو جاتی ہیں اور پودا نشوونما کے بعد زمین پر ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک باپ یا ایک شوہر اپنی زوجہ یا اپنی کھیتی میں بیج ڈالتا ہے تو زمین کی طرح وہاں بھی نشوونما کا سلسلہ ایک بیج کی طرح قائم ہے۔ سب سے پہلے ابتدائی درجے میں ایک نرم و نازک تنا وجود میں آتا ہے جو NOTOCHORD کہلاتا ہے۔ نشوونما کا یہ سلسلہ ارتقائی منازل طے کر کے جب تکمیل کو پہنچتا ہے بالکل اسی طرح جیسے زمین اپنے پیٹ سے کسی درخت کو باہر نکالتی ہے، ماں کے پیٹ سے بچہ تولد ہوتا ہے۔

تخلیقی سانچے

نسلی سلسلے کے بارے میں یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ پیدائش میں انسان، کتے اور بلی یکساں نوعیت کے حامل ہیں۔ ایک مائع لعاب (SPERMS) جب دوسرے لعاب (OVA) میں مل کر تحلیل ہو جاتا ہے اور تخلیقی سانچے میں ٹھہر جاتا ہے تو ایک خاص پروسس (PROCESS) کے تحت اس کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے۔ پہلی رات یہ محلول مٹر کے ایک دانے کے برابر ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بڑھ کر ایک جیتی جاگتی، دیکھتی ہنستی، سنتی، محسوس کرتی تصویر بن جاتی ہے۔ اس تصویر میں دس سوراخ ہوتے ہیں اور یہ دس سوراخ پوری زندگی پر محیط ہیں۔ ان ہی دس سوراخوں پر آدمی کی صلاحیتوں کا دارومدار ہے۔ بولنا، سننا، سونگھنا، جسم کے اندر زہریلے اور فاسد مادّوں کو خارج کر کے جسم کو صاف ستھرا کرنا اور مادی زندگی کی حفاظت کرنا ان ہی دس سوراخوں پر قائم ہے۔ ان دس سوراخوں میں سے ایک سوراخ بھی اپنی ڈیوٹی پوری نہ کرے یا

یہ سوراخ کسی بھی معنی میں سوراخ نہ رہے تو اسی مناسبت سے انسانی زندگی میں خلا واقع ہو جاتا ہے اور وہ بے کار، کم صلاحیت یا عضوِ معطل بن جاتا ہے۔ ان دس سوراخوں کی تقسیم اس طرح ہے۔

کانوں کے دو سوراخ آدم زاد کے اندر قوتِ سامعہ ہیں۔ آنکھوں کے دو سوراخ باصرہ (VISION) یعنی باہر کے عکس کو دماغ کی اسکرین پر منتقل کر کے کسی چیز کے ہونے کا علم فراہم کرتے ہیں اور یہ علم مختلف مراحل سے گزر کر لامسہ بن جاتا ہے۔ ناک کے دو سوراخ ہمیں قوتِ شامہ عطا کرتے ہیں۔ منہ اور حلق کے دو سوراخ ہمیں غذائی معاملات میں خود کفیل کرتے ہیں۔ ایک طرف ہماری تمام غذائی ضروریات کا دارومدار اس سوراخ پر ہے، دوسری طرف یہ سوراخ قوتِ گویائی عطا کرتے ہیں۔ نواں سوراخ جہاں کثافت کو دور کرنے ذریعہ ہے، وہ افزائشِ نسل کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ غذا میں سے توانائی (ENERGY) حاصل کرنے کے بعد جو فضلہ باقی رہ جاتا ہے، دسواں سوراخ ان کے اخراج کا ذریعہ ہے۔ یہ ایک نظام ہے جو تواتر کے ساتھ قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔

ہمیں بیج کے پھوٹنے پر تین چیزوں کا ادراک ہوتا ہے۔ ایک تنا اور دو پتے۔ اس تخلیقی عمل سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ ہر چیز اور ہر وجود دو رخوں پر قائم ہے اور پھر یہ دو رخ تقسیم ہو کر کئی رخ بن جاتے ہیں۔ آدمی بھی دو رخوں سے مرکب ایک تصویر ہے۔ آدمی کے اندر دو دماغ ہوتے ہیں۔ ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف۔ دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ ناک کے دو نتھنے ہوتے ہیں۔ حلق بظاہر

ایک نظر آتا ہے مگر حلق کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا (UVULA) یا کوا لٹکا رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے حلق دو حصوں پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ دو ہاتھ ہوتے ہیں۔ دو ٹانگیں ہوتی ہیں۔ دو پیر ہوتے ہیں۔ دو گردے ہوتے ہیں۔ دو جگر ہوتے ہیں۔ دل کو اگر تقسیم کیا جائے تو وہ ایک پردے (SEPTUM) کے ذریعے بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ پھیپھڑے دو ہیں۔ علیٰ ہٰذالقیاس انسانی مادی جسم کا جب تجزیہ کیا جاتا ہے تو ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ انسان کی تخلیق دو رخوں پر قائم ہے۔ مزید سوچ بچار اور چھان بین کی جائے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نوع انسان اور تمام نوعیں بھی دو رخوں پر قائم ہیں۔ ایک مذکر (MALE) ، ایک مؤنث (FEMALE)۔ ایک مرد، ایک عورت۔ ایک باپ، ایک ماں۔

جنسی کشش کا قانون

تخلیق کا قانون ہمیں بتاتا ہے کہ مرد کا وجود بھی دو رخوں پر قائم ہے اور عورت کا وجود بھی دو رخوں پر قائم ہے۔ عورت کے اندر مرد چھپا ہوا ہے اور مرد کے اندر عورت چھپی ہوئی ہے۔ اگر آدم کے اندر حوّا نہ ہوتی تو حوّا کی پیدائش ممکن نہیں تھی۔ دوسری مثال حوّا کے اندر سے آدم کی پیدائش ہے جس کو آسمانی کتابوں نے "عیسیٰ" کا نام دیا ہے۔ اسی طرح ہر فرد دو پرت سے مرکب ہے۔ ایک پرت ظاہر اور غالب رہتا ہے اور دوسرا پرت مغلوب اور چھپا ہوا رہتا ہے۔ مرد ہو یا عورت دونوں دو دو رخوں سے مرکب ہیں۔ ایک ظاہر رُخ اور ایک باطن رُخ۔ عورت میں ظاہر رُخ عورت کے خد و خال میں جلوہ نما ہو کر ہمیں نظر آتا ہے اور باطن رُخ وہ ہے جو نظر نہیں آتا۔ اسی طرح مرد کا ظاہر رُخ مرد کے خد و خال بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور باطن رُخ

وہ ہے جو مخفی رہتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ مرد بحیثیت مرد کے جو نظر آتا ہے وہ اس کا ظاہر رُخ ہے۔ اور عورت بحیثیت عورت جو نظر آتی ہے وہ اس کا ظاہر رُخ ہے۔ مرد کے ظاہر رُخ کا متضاد باطن رُخ "عورت" اس کے ساتھ لپٹا ہوا ہے اور عورت کے ظاہر رُخ کے ساتھ اس کا متضاد باطن رُخ "مرد" لپٹا ہوا ہے۔ افزائش نسل اور جنسی کشش کا قانون بھی ان ہی دو رخوں پر قائم ہے۔ عورت کے اندر باطن رُخ مرد چوں کہ مغلوب ہے اور غالب خد و خال میں نمودار ہو کر مظہر نہیں بنا ہے اس لئے وہ غالب اور مکمل رُخ کو اپنانا چاہتا ہے اور اس کے اندر جذب ہونے کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ اسی طرح مرد کے اندر چھپا ہوا پرت "عورت" چوں کہ مغلوب اور نامکمل ہے اس لئے وہ بھی عورت کے ظاہری رُخ سے ہم آغوش ہو کر اپنی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جنسی کشش اس عورت یا مرد میں نہیں ہوتی جو ہماری نظروں کے سامنے ہے بلکہ عورت کے اندر چھپا ہوا رُخ اس مرد سے ہم آغوش ہو کر اپنی تکمیل چاہتا ہے جو ہمیں جیتی جاگتی شکل میں نظر آتی ہے۔ اسی کو عرفِ عام میں "جنسی جذبہ" کہتے ہیں۔

جنسی تبدیلی کے واقعات اکثر و بیشتر ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باطنی رُخ کی تحریکات اتنی زیادہ سریع السیر اور غالب ہو جاتی ہیں کہ ظاہری رُخ کی اپنی تحریکات بظاہر معطل اور معدوم ہو جاتی ہیں۔ یہ تبدیلی اس طرح واقع ہوتی ہے کہ مرد کے اندر عورت کا باطن رُخ غالب ہو جاتا ہے اور ظاہر رُخ، مرد کی تحریکات مغلوب ہو جاتی ہیں اور نتیجے میں کوئی مرد عورت بن جاتا ہے، اور اسی طرح کسی عورت میں ظاہری رُخ کی تحریکات مغلوب ہو جاتی ہیں تو وہ مرد بن جاتی ہے۔

ظاہر اور باطن

یہ ایک تخلیقی لامتناہی سلسلہ ہے جو ہمیں اس تفکر کی دعوت دیتا ہے کہ ایک ہمارا ظاہر ہے، دوسرا ہمارا باطن۔ ظاہر کو ہم "مادہ" کہتے ہیں۔ اور باطن کو "روح" کہا جاتا ہے۔ رُوح بھی دو رُخ پر قائم ہے۔ رُوح کا مظاہرہ ایک رُوح کے بنائے ہوئے لباس سے ہوتا ہے اور رُوح کا دوسرا مظاہرہ خود روح ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب، لوح و قلم میں اس کی مثال قمیض اور جسم سے دی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہمارے سامنے ایک مجسمہ ہے جو گوشت اور پوست سے مرکب ہے۔ طبی نقطۂ نظر سے ہڈیوں کے ڈھانچے پر رگ پٹھوں کی بناوٹ کو ایک جسم کی شکل و صورت دی گئی ہے۔ ہم اس کا نام "جسم" رکھتے ہیں اور اس کو اصل سمجھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے ایک چیز اختراع کی گئی ہے جس کا نام "لباس" ہے۔ یہ لباس سوتی کپڑے کا، اُونی کپڑے کا یا کسی کھال وغیرہ کا ہوا کرتا ہے۔ اس لباس کا محلِ استعمال صرف گوشت پوست کے جسم کی حفاظت ہے۔ فی الحقیقت اس لباس میں اپنی کوئی زندگی یا اپنی کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ جب یہ لباس جسم پر ہوتا ہے تو جسم کے ساتھ حرکت کرتا ہے یعنی اس کی حرکت جسم سے منتقل ہو کر اس کو ملی۔ لیکن درحقیقت وہ جسم کے اعضا کی حرکت ہے۔ جب ہم ہاتھ اٹھاتے ہیں تو آستین بھی گوشت پوست کے ہاتھ کے ساتھ حرکت کرتی ہے۔ یہ آستین اس لباس کا حصہ ہے جو لباس جسم کی حفاظت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس لباس کی تعریف کی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ جب یہ لباس جسم پر ہوتا ہے تو جسم کی حرکت اس کے اندر منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس لباس کو اتار کر چارپائی پر ڈال دیا جائے یا کھونٹی پر لٹکا دیا جائے تو اس کی

تمام حرکتیں ساقط ہو جاتی ہیں۔ اب ہم لباس کا جسم کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں۔ اس کی کتنی ہی مثالیں ہو سکتی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال دے کر صحیح مفہوم ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی مر گیا۔ مرنے کے بعد اس کے جسم کو کاٹ ڈالئے، ٹکڑے کر دیجئے، کچھ کیجئے جسم کی اپنی طرف سے کوئی مدافعت، کوئی حرکت عمل میں نہیں آئے گی۔ اس مردہ جسم کو ایک طرف ڈال دیجئے تو اس میں زندگی کا کوئی شائبہ کسی لمحے بھی پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے۔ اس کو جس طرح ڈال دیا جائے گا پڑا رہے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مرنے کے بعد جسم کی حیثیت صرف لباس کی رہ جاتی ہے۔ اصل انسان اس میں موجود نہیں رہتا۔ وہ اس لباس کو چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہے۔ اگر یہ جسم اصل انسان ہوتا تو کسی نہ کسی نوعیت سے اس کے اندر زندگی کا کوئی شائبہ ضرور پایا جاتا۔ لیکن نوعِ انسانی کی مکمل تاریخ ایسی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتی کہ کسی مُردہ جسم نے کبھی حرکت کی ہو۔ اس صورت میں ہم اس انسان کا تجسّس کرنے پر مجبور ہیں جو جسم کے اس لباس کو چھوڑ کر کہیں رخصت ہو جاتا ہے۔ اس ہی انسان کا نام انبیائے کرام کی زبان میں "رُوح" ہے۔ اور وہی انسان کا اصل جسم ہے۔ نیز یہی جسم ان تمام صلاحیتوں کا مالک ہے جن کے مجموعے کو ہم زندگی سے تعبیر کرتے ہیں":

جسم اور لباس کی اس خوبصورت تشبیہ اور مثال سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اصل انسان یا اصل زندگی لباس نہیں ہے۔ جب تک جسم کے اوپر لباس ہے، لباس کی حیثیت برقرار ہے اور جب ہم لباس کو اُتار دیتے ہیں یا لباس سے اپنی دلچسپی ختم کر دیتے ہیں تو لباس کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ لباس بکھر جاتا ہے، فنا ہو جاتا ہے۔

نوعی اشتراک

ہماری فطرت اور جبلت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جبلت میں ہمارا دوسری نوعوں مثلاً بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، کتے، بلی، سانپ، کبوتر، فاختہ وغیرہ کے ساتھ ذہنی اشتراک ہے۔ اور فطرت میں ہم اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ اور یہ مقام ہمیں ایک ہستی نے جو تمام نوعوں سے ماوراء ہے اور جو تمام افرادِ کائنات پر فضیلت رکھتی ہے، عطا کیا ہے اور یہ عطا ایک فاصل عقل یا تفکر ہے۔ کوئی ذی فہم اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ حیوانات میں عقل و شعور نہیں ہے۔ بعض معاملات میں جانور انسان سے زیادہ باشعور اور باعقل ہیں۔

زمین پر ایسے چوپائے بھی موجود ہیں جن میں مستقبل بینی کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بلی، کتے اور کئی دوسرے جانوروں کو آنے والی مصیبتوں، زلزلوں کا پہلے سے پتہ چل جاتا ہے۔

۱۹۰۶ء میں سان فرانسیسکو کے تاریخی زلزلے سے قبل کتوں نے روز و شب بھونکنا اور چیخنا شروع کر دیا تھا اور لوگوں کی رات کی نیند اور دن کا سکون غارت ہو گیا تھا۔ مرغابیاں بلند درختوں کی طرف پرواز کر گئیں اور سؤروں نے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا۔ گائیں رسیاں توڑ توڑ کر بھاگنے لگیں۔

زمین دوز چوہے

اسی طرح قدیم یونانی شہر ہیلس میں زیرِ زمین رہنے والے چوہے

(WEASELS) اور دیگر بے شمار حیوانات زلزلے سے پانچ روز قبل شہر سے فرار ہو گئے۔ چلی کے شہر کون سیپکون کی فضا غول در غول پرواز کرتے ہوئے انجانے خوف کے شکار پرندوں کی چیخوں سے لرز اٹھی اور اس کے بعد یہ شہر زلزلے کی نذر ہو گیا۔

طاقت ور حسیات

زیادہ تر زلزلے اچانک نہیں آتے۔ زمین کی زیریں سطح کی چٹانوں کا باہمی ٹکراؤ ابتدائی مراحل کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ مستقل بڑھتا ہوا ارضیاتی دباؤ سطحِ زمین کے جھکاؤ اور ابھار میں غیر معمولی تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔ زلزلے کی لہریں زیرِ زمین چٹانوں میں رونما ہونے لگتی ہیں۔ زمین کے مقناطیسی میدان میں خفیف سا رد و بدل ہوتا ہے۔ انسانی حسی صلاحیت ان تمام ابتدائی کیفیات کو محسوس کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن حیوانات اس قدر حساس ہوتے ہیں کہ زلزلے سے قبل چٹانوں کی زیرِ زمین معمولی سی ٹوٹ پھوٹ کو محسوس کر لیتے ہیں۔

انسان کی سماعتی صلاحیت (HEARING POWER) نسبتاً انتہائی محدود ہوتی ہے۔ انسان ایک ہزار چکر فی سیکنڈ کی آواز کی لہروں کو محسوس کر سکتا ہے لیکن ۲۰ ہزار چکر فی سیکنڈ یا اس سے زیادہ چکر کی آواز کی لہروں کو انسانی کان سن نہیں سکتے۔ اس کے برعکس کتے، بلیاں اور لومڑیاں ساٹھ ہزار چکر فی سیکنڈ کی آوازیں سن سکتے ہیں۔ چوہے، چمگادڑ، وھیل اور ڈولفن ایک لاکھ چکر فی سیکنڈ کی آوازیں سن سکتے ہیں۔

مچھلیاں بھی سمندر میں انتہائی مدھم ارتعاش کو محسوس کر لیتی ہیں۔

انسان میں دیکھنے کی حد (RANGE) بہت کم ہوتی ہے جب کہ شہد کی

مکھی ماورائے بنفشی شعاعیں (ULTRAVIOLET RAYS) دیکھ سکتی ہے۔
انسان کے مقابلے میں شاہین کی آنکھ کسی چیز کو آٹھ گنا بڑا دیکھتی ہے۔

سُراغ رساں کتّے

دنیا بھر میں پولیس مجرموں کو تلاش کرنے اور انہیں پہچاننے کے لئے عرصے سے کتّوں کو استعمال کر رہی ہے۔ جہاں انسانی ناک میں تقریباً پانچ ملین حسّی خلیات (SENSORY CELLS) ہوتے ہیں، کتّوں کی کچھ نسلوں میں دو سو ملین سے زیادہ خلیات ہوتے ہیں۔ اسی مناسبت سے کتے میں سونگھنے کی حس انسان سے کئی ملین زیادہ ہوتی ہے۔

انڈوں کی تقسیم

شتر مرغ میں عقل و فہم کا اندازہ اس عمل سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے انڈوں کی تین قسمیں کرتا ہے۔ کچھ کو ریت میں دبا دیتا ہے، چند کو دھوپ میں چھوڑ دیتا ہے اور بقیہ کو سینے لگتا ہے۔ جب انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو دھوپ میں رکھے ہوئے انڈوں سے رقیق مادہ نکالتا ہے اور بچوں کو پلاتا ہے۔ اس غذا سے بچوں میں نشو ونما کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور جب بچے قدرے بڑے ہو جاتے ہیں تو ریت میں دبائے ہوئے انڈوں کو توڑ کر تھوڑی دیر کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ ریت میں دبنے کی وجہ سے اور ٹوٹنے کے بعد براہِ راست دھوپ پڑنے سے ان انڈوں میں کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ کیڑے مکوڑے ان بچوں کی غذا بن جاتے ہیں۔ جب بچوں کی نشو ونما کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو پھر گھاس پھوس کو اپنی غذا بنا لیتے ہیں اور یوں یہ بچے سنِ بلوغت میں قدم رکھ دیتے ہیں۔ شتر مرغ کا انڈوں کو اس طرح رکھنا کسی طور

عقل و دانشمندی سے کم نہیں ہے۔

بجلی کی دریافت سے پہلے

ہمارے سامنے چڑیا سے بھی چھوٹا پرندہ "بیا" ہے۔ بیا کا مکان ایک پوری سائنس ہے، ایک پورا نقشہ ہے، ایک پوری پلاننگ ہے۔ تنکوں کے اس گنبد نما لٹکے ہوئے گھر میں کمرے بھی ہوتے ہیں۔ سونے کے لئے بستر بھی ہوتے ہیں۔ اور بچوں کے جھولنے کے لئے جھولا بھی ہوتا ہے۔ یہ ناقابلِ تذکرہ دو انچ کی چڑیا اتنی عقل و فہم رکھتی ہے کہ اپنے گھر کو روشن رکھنے کے لئے جگنو کو گرفتار کر لیتی ہے اور جگنو کی چمک سے اس کے گھر میں روشنی رہتی ہے۔ یعنی یہ چھوٹا سا پرندہ بجلی (ELECTRICITY) کی دریافت سے پہلے بھی بجلی کی سائنس سے واقف تھا اور جگنو کو نسل بعد نسل بطور قمقمے (BULBS) کے استعمال کر رہا ہے۔

بارش کی آواز

ایک آسٹریلوی پرندہ کیوی اپنے رزق کے حصول کیلئے جو طریقہ اختیار کرتا ہے وہ کافی دلچسپ ہے۔
جب کافی تلاش کے باوجود شکار ہاتھ نہیں لگتا تو یہ ایسی آواز نکالتا ہے جو بارش کی آواز سے مشابہ ہوتی ہے۔ زمین کے اندر رہنے والے کیڑے مکوڑے یہ سمجھ کر کہ بارش ہو رہی ہے، زمین سے باہر نکل آتے ہیں اور اس پرندے کی غذا بن جاتے ہیں۔

منافق لومڑی

لومڑی اپنی چالاکی اور عیاری کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ جس دن آسانی سے شکار ہاتھ نہیں آتا تو یہ لومڑی چالاکی پر اتر آتی ہے۔ جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر زمین پر لیٹ جاتی ہے اور سانس کھینچ کر خوب

پیٹ پھولا لیتی ہے۔ پرندے اسے مردہ سمجھ کر اپنی خوراک بنانے کے لئے قریب آتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ پرندے لومڑی کو اپنی غذا بنائیں، لومڑی انہیں اپنی غذا بنا لیتی ہے۔

کیلے کے باغات

جے۔ ایچ۔ ولیم نے اپنی کتاب (THE ELEPHANT) میں دو نوعمر ہاتھیوں کا ذکر کیا ہے جو عموماً کھلے پھرتے تھے لیکن ان کی گردنوں میں بلند آواز والی گھنٹیاں لٹکا دی گئی تھیں تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ وہ کہاں ہیں۔ ایک روز یہ دونوں قریب کے تالاب کے کنارے گئے اور وہاں سے گیلی مٹی اٹھا کر اپنی اپنی گھنٹی میں بھر لی۔ نتیجتاً گھنٹیاں بجنا بند ہو گئیں۔ پھر ان دونوں نے کیلوں کے باغوں کا رُخ کیا۔ اور خوب جی بھر کر کیلے کھائے۔

ایک ترکیب

دو ڈولفین ایک سانپ نما مچھلی ایل (EEL) کے ساتھ کھیل رہی تھیں اور اس کا پیچھا کر کے اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چالاک ایل نے ڈولفنوں سے بچنے کے لئے اچانک غوطہ لگایا اور ایک سوراخ میں گھس کر پناہ گزیں ہو گیا۔ اب ذرا ڈولفن کی ذہانت ملاحظہ فرمائیں کہ ان میں سے ایک نے ایک ایسی مچھلی پکڑ لی جس کے منہ پر زہریلا ڈنک ہوتا ہے۔ اور دُم سے پکڑ کر مچھلی کا سر اس سوراخ میں داخل کر دیا جس میں ایل چھپا بیٹھا تھا۔ ایل نے جو زہریلی مچھلی کو دیکھا تو سوراخ سے نکل کر بھاگا اور کھیل دوبارہ شروع ہو گیا۔

حضرت بابا تاج الدین ناگپوری رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے اور قلندر شعور کے بانی قلندر بابا اولیاءؒ اپنی کتاب "تذکرہ تاج الدین باباؒ" میں شیر کی عقیدت کا واقعہ اور اس واقعے کی علمی توجیہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

شیر کی عقیدت

"ایک دن نانا تاج الدینؒ واکی شریف کے جنگل (بھارت) میں چند لوگوں کے ساتھ پہاڑ پر چڑھتے چلے گئے۔ نانا رحؒ مسکرا کر کہنے لگے۔ "میاں! جس کو شیر کا ڈر ہو، وہ چلا جائے۔ میں تو یہاں ذرا سی دیر آرام کروں گا۔ خیال ہے کہ شیر ضرور آئے گا۔ جتنی دیر قیام کرے اس کی مرضی۔ تم لوگ جاؤ، کھاؤ پیو۔ اور مزے کرو۔" بعض لوگ اِدھر اُدھر چھپ گئے اور زیادہ چلے گئے۔

گرمی کا موسم تھا۔ درختوں کا سایہ اور ٹھنڈی ہوا خمار کا طوفان اٹھا رہی تھی۔ نانا اب دبیز گھاس پر لیٹ چکے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ فضا میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔

چند منٹ گزرے ہی تھے کہ جنگل بھیانک محسوس ہونے لگا۔ اس کے بعد بھی کچھ وقفہ ایسے گزر گیا جیسے شدید انتظار ہو۔ یہ انتظار کسی سادھو، کسی جوگی، کسی اوتار، کسی ولی یا کسی انسان کا نہیں تھا بلکہ ایک درندہ کا تھا جو کم از کم میرے ذہن میں قدم بہ قدم حرکت کر رہا تھا۔ یکایک نانا رحؒ کی طرف نگاہیں متوجہ ہو گئیں۔ ان کے پَیروں کی طرف ایک طویل القامت شیر ڈھلان سے اوپر چڑھ رہا تھا، بڑی آہستہ خرامی سے، بڑے ادب کے ساتھ۔

شیر نیم وا آنکھوں سے نانا تاج الدین رحؒ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ذرا دیر میں وہ پیروں کے بالکل قریب آ گیا۔ نانا گہری نیند میں بے خبر تھے۔ شیر زبان سے تلوے چھو رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس کی آنکھیں مستانہ واری سے بند ہو گئیں۔ اس نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا۔

نانا تاج الدین رحؒ ابھی تک سو رہے تھے۔ شیر نے اب ذرا آہٹ کر کے تلوے

چاٹنا شروع کر دیے۔ اس حرکت سے نانا کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شیر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کہنے لگے۔ "تو آگیا۔ اب تیری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ میں تجھے تندرست دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اچھا، اب جاؤ"۔ شیر نے بڑی ممنونیت سے دُم ہلائی اور چلا گیا۔

میں نے ان واقعات پر بہت غور کیا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ شیر پہلے کبھی ان کے پاس آیا تھا۔ مجبوراً اس امر کا یقین کرنا پڑتا ہے کہ نانا اور شیر پہلے سے ذہنی طور پر روشناس تھے۔ روشناسی کا طریقہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اَنا کی جو لہریں نانا اور شیر کے درمیان ردّ و بدل ہوتی تھیں وہ آپس کی ملاقات کا باعث بنتی تھیں۔ عارفین میں کشف کی روش عام طور پر یہی ہوتی ہے۔ لیکن اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جانوروں میں بھی کشف اسی طرح ہوتا ہے۔ کشف کے معاملے میں انسان اور دوسری مخلوق یکساں ہے۔

اَنا کی لہریں

یہ قانون بہت فکر سے ذہن نشیں کرنا چاہیئے کہ جس قدر خیالات ہمارے ذہن میں دَور کرتے رہتے ہیں ان میں بہت زیادہ ہمارے معاملات سے غیر متعلق ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق قریب اور دُور کی ایسی مخلوق سے ہوتا ہے جو کائنات میں کہیں نہ کہیں موجود ہو۔ اس مخلوق کے تصورات لہروں کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ جب ہم ان تصوّرات کا جوڑ اپنی زندگی سے ملانا چاہتے ہیں تو ہزار کوشش کے باوجود ناکام رہ جاتے ہیں۔ اَنا کی جن لہروں کا ابھی تذکرہ ہو چکا ہے ان کے بارے میں بھی چند باتیں غور طلب ہیں۔ سائنسداں روشنی کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ اتنی تیز رفتار نہیں ہے کہ زمانی اور مکانی فاصلوں کو منقطع کر دے۔ البتّہ اَنا کی لہریں لاتناہیت میں بیک وقت ہر جگہ موجود ہیں۔ زمانی مکانی فاصلے ان کی گرفت میں رہتے ہیں۔

بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان لہروں کے لئے زمانی مکانی فاصلے موجود ہی نہیں ہیں روشنی کی لہریں جن فاصلوں کو کم کرتی ہیں، اَنا کی لہریں ان ہی فاصلوں کو بجائے خود موجود نہیں جانتیں۔

خاموش گفتگو

انسانوں کے درمیان ابتدائے آفرینش سے بات کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ آواز کی لہریں جس کے معنی معین کر لئے جاتے ہیں، سننے والوں کو مطلع کرتی ہیں۔ یہ طریقہ اس ہی تبادلہ کی نقل ہے جو اَنا کی لہروں کے درمیان ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ گونگا آدمی اپنے ہونٹوں کی خفیف جنبش سے سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ اور سمجھنے کے اہل سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی پہلے طریقہ کا عکس ہے۔ جانور آواز کے بغیر ایک دوسرے کو اپنے حال سے مطلع کر دیتے ہیں یہاں بھی اَنا کی لہریں کام کرتی ہیں۔ درخت آپس میں گفت گو کرتے ہیں۔ یہ گفتگو صرف آمنے سامنے کے درختوں میں ہی نہیں ہوتی بلکہ دور دراز ایسے درختوں میں بھی ہوتی ہے جو ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ یہی قانون جمادات میں بھی رائج ہے۔ کنکروں، پتھروں، مٹی کے ذرّوں میں من و عن اسی طرح تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔

ایک لاشعور

انبیاؑ اور روحانی طاقت رکھنے والے انسانوں کے کتنے ہی واقعات اس کے شاہد ہیں کہ ساری کائنات میں ایک ہی لاشعور کارفرما ہے۔ اس کے ذریعے غیب و شہود کی ہر لہر دوسری لہر کے معنی سمجھتی ہے، چاہے یہ دونوں لہریں کائنات کے دو کناروں پر واقع ہوں۔ غیب و شہود کی فراست اور معنویت کائنات کی رگِ جان ہے۔ ہم اس رگِ جاں میں جو خود ہماری اپنی رگِ جان بھی ہے، تفکر اور توجہ کر کے اپنے سیّارے اور دوسرے

سیاروں کے آثار و احوال کا انکشاف کر سکتے ہیں۔ انسانوں اور حیوانوں کے تصورات، جنّات اور فرشتوں کی حرکات و سکنات، نباتات و جمادات کی اندرونی تحریکات معلوم کر سکتے ہیں۔

مسلسل توجہ دینے سے ذہن کائناتی لاشعور میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہمارے سراپا کا مصنوعی پرت اَنا کی گرفت سے آزاد ہو کر ضرورت کے مطابق ہر چیز دیکھتا سمجھتا اور ذہن میں محفوظ کر دیتا ہے۔

مثالی معاشرہ

حیوانات میں زندگی گزارنے کی قدریں بھی انسان کی معاشرتی زندگی سے کافی حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔ جو ہمیں حیوانات کی عقلی بیداری کا ثبوت فراہم کرتی ہیں جس کی چند مثالیں ہدیۂ قارئین ہیں۔

اس کی ایک مثال حشرات الارض کے خاندان کے ایک فرد "شہد کی مکھی" کی ہے۔ شہد کی مکھیاں (HONEY BEES) اپنی پوری فیملی یا ایک کالونی میں موم کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے ہشت پہلو کمروں پر مشتمل ایک چھتے میں رہتی ہیں۔ ان سب میں ایک ملکہ ہوتی ہے۔ رعایا میں تقریباً دو ہزار نر مکھیاں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ مادہ مکھیاں ہوتی ہیں۔ ان کی تعداد ایک چھتے میں بیس ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ کارکن مکھیاں مادہ ہونے کے باوجود انڈے دینے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔

ملکہ دوسری تمام مکھیوں سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ یہ ہر وقت چھتے کے اندر رہتی ہے۔ ملکہ ایک دن میں تقریباً ایک ہزار سے دو ہزار تک انڈے دیتی ہے۔ انڈے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مکمل انڈے (FERTILIZED EGGS) اور دوسرے نامکمل انڈے (UNFERTILIZED EGGS)۔ مکمل انڈوں سے ملکہ اور کارکن

مکھیاں نکلتی ہیں جب کہ نامکمل انڈوں سے نر مکھیاں نکلتی ہیں۔ چند مکھیاں ہر وقت ملکہ کی خدمت کے لئے موجود رہتی ہیں۔ یہ مکھیاں ہر طرح سے ملکہ کا خیال رکھتی ہیں۔ ملکہ کی اوسط عمر تین سال ہوتی ہے۔ ملکہ جب تک انتظامی امور احسن طریقے پر انجام دیتی رہتی ہے۔ محافظ مکھیاں اس کی ہر طرح سے خدمت انجام دیتی ہیں۔ لیکن ملکہ جب اپنے فرائض سے غفلت برتنے لگتی ہے یا بوڑھی ہو جاتی ہے تو یہی محافظ مکھیاں اس کے گرد جمع ہو جاتی ہیں اور تمام مکھیاں ملکہ پر حملہ کر دیتی ہیں اور ڈنک مار مار کر ملکہ کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ ملکہ کی ہلاکت کی خبر پوری کالونی کو دینے کے لئے چند مکھیاں ایک خاص آواز نکالتی ہیں اور آواز نکالتے وقت چھتے کے گرد کئی چکر کاٹتی ہیں۔ ملکہ کی طبعی عُمر تین سال ہوتی ہے۔

نئی ملکہ کی تقرری کے لئے کارکن مکھیاں انڈوں میں سے تین دن پرانے مکمل انڈے تلاش کر کے لے آتی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد انڈوں سے کیڑے نکل آتے ہیں۔ کارکن مکھیاں انہیں پھولوں کے جمع کئے ہوئے زرِ گل کھلاتی اور پھولوں کا رس پلاتی ہیں کچھ دنوں کے بعد ان کیڑوں یا لاروؤں کے اوپر ایک غلاف چڑھ جاتا ہے۔ اس غلاف سے ڈھکے ہوئے کیڑے کو پیوپا کہتے ہیں۔ مکھیاں پیوپا کے خانوں کو موم لگا کر بند کر دیتی ہیں۔ پندرہ دن کے بعد پیوپا ایک بالغ مکھی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور موم ہٹا کر خانوں سے باہر نکل آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا تقرر بحیثیت ملکہ ہو جاتا ہے اور باقی ملکہ مکھیاں اڑ جاتی ہیں اور ہر ملکہ اپنا علیحدہ چھتہ بنا لیتی ہے۔

کارکن مکھیاں ملکہ سے قدرے چھوٹی ہوتی ہیں۔ کارکن مکھیوں کی اوسط عمر دو ماہ ہوتی ہے اور دو ماہ کی مختصر زندگی محنت و مشقت کرتے گزر جاتی ہے۔ انڈوں سے

نکلنے کے تیسرے دن سے کارکن مکھیاں اپنا کام شروع کر دیتی ہیں۔ یہی مکھیاں چھتہ تیار کرتی ہیں۔ کارکن مکھیوں کے اندر موم پیدا کرنے والے گلینڈز ہوتے ہیں جو موم پیدا کرتے ہیں اور یہ موم چھتہ تیار کرنے میں کام آتا ہے۔ یہ چھتہ کئی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ چھتے کا درمیانی حصہ جو دوسرے تمام خانوں سے بڑا اور ہوادار ہوتا ہے، ملکہ کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ چھتے میں نر مکھیوں کے لئے سیکڑوں خانے ہوتے ہیں۔ مادہ مکھیوں کے کے بے شمار گھروں کے علاوہ شہد کو ذخیرہ کرنے کے لئے کئی گودام ہوتے ہیں اور پھولوں کے زردانوں کے لئے الگ گودام ہوتے ہیں جو مکھیوں کی خوراک بنتے ہیں۔

شہد کیسے بنتا ہے

تمام مکھیوں کے لئے خوراک کا انتظام کرنا ان ہی کارکن مکھیوں کی ذمّہ داری ہوتی ہے۔ یہی مکھیاں چھتّوں سے پھولوں کے رس کی تلاش کے لئے نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ اور پھر اس رس سے شہد تیار کرتی ہیں۔ مکھیاں مختلف پھولوں پر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور پھولوں کی اندرونی سطح پر موجود ہلکی مٹھاس کو اپنی زبان سے رگڑتی ہیں۔ اس رگڑ کے نتیجے میں مٹھاس زبان پر منتقل ہو جاتی ہے اور یہ مٹھاس مکھی کے معدے نما تھیلی (HONEY STOMACH) میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ یہ مختصر تھیلی پھولوں کے رس سے بھر جاتی ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر یہ مکھی پھولوں کے زرِ گل کو اکٹھا کر کے اپنے پچھلے پاؤں میں موجود قدرتی ٹوکریوں کو بھر لیتی ہے۔ مکھی اس تمام کارروائی کے بعد اپنے چھتّے پر واپس آجاتی ہے۔ چھتے میں پہنچتے ہی مکھی موم کے ایک خانے میں گھس جاتی ہے اور زرِ گل کو گوداموں میں منتقل کر دیتی ہے۔ اس اثنا میں پھولوں کا رس جو معدہ نما تھیلی میں جمع ہوتا ہے کئی کیمیائی تبدیلیوں کے بعد شہد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس شہد کو گوداموں میں محفوظ کر کے

موم سے سیل کر دیا جاتا ہے تاکہ موسمِ سرما میں مکھیاں اس شہد کو اپنے استعمال میں لا سکیں۔ لیکن حضرتِ انسان مکھیوں سے نظر بچا کر لے اڑتے ہیں اور بے چاری مکھیاں شہد کی اس چوری کے بعد پھر اس ہی مستعدی اور محنت سے شہد بنانے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

نر مکھیاں نہایت کاہل ہوتی ہیں۔ یہ ملکہ کے شوہر کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ جب ملکہ بالغ ہو جاتی ہے تو اپنے چھتّے سے اڑتی ہے۔ نر مکھیاں فوراً اس کے تعاقب میں اڑتی ہیں اور ان میں سے ایک نر مکھی ملکہ کو حاملہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ SEX کے علاوہ نر مکھیاں کوئی کام نہیں کرتیں۔ ملکہ کے انڈے دینے کے بعد نر مکھیاں اپنی طبعی موت مر جاتی ہیں۔

فہم و فراست

گرمیوں کے دنوں میں گرمی کی شدّت سے موم نرم پڑ جانے کا خطرہ ہوتا ہے لیکن یہ ننھا کیڑا اپنی عقلمندی کی وجہ سے اپنے گھر کو برباد ہونے سے بچا لیتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ گرمیوں کے دنوں میں تمام کارکن مکھیاں چھتّے کے تمام خانوں کے کناروں پر اس طرح بیٹھ جاتی ہیں کہ ان کے پر خانوں سے باہر رہیں۔ اب پروں کو تیزی سے حرکت دی جاتی ہے۔ پروں سے پنکھوں کا کام لیتے ہوئے ہوا کو ٹھنڈا کر کے اندر بھیجا جاتا ہے جس سے ٹمپریچر گر جاتا ہے اور مکھیوں کے گھر گرمی کی تپش سے محفوظ رہتے ہیں۔ اللہ نے مکھی کو یہ صلاحیت وحی کی ہے کہ مکھی ایسے پھول کا عرق نہیں چوستی جو بیمار اور زہریلا ہو۔ ہمیشہ ایسے پھولوں کا انتخاب کرتی ہے جن پھولوں کے ذریعے زمین سے صحت بخش عرق کشید ہوتا ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ شہد بے شمار امراض کا علاج ہے۔

عقل مند چیونٹی

چیونٹی جیسی انتہائی چھوٹی مخلوق کی عقل کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک چیونٹی نے حضرت سلیمانؑ کے لشکر کی دعوت کی۔ حضرت سلیمانؑ ایک جلیل القدر پیغمبر اور عظیم بادشاہ گزرے ہیں۔ آپ کے لشکر میں انسانوں کے علاوہ جنات، چرند، پرند، درند سب ہی شامل تھے۔ آپ کو ہواؤں اور موسموں پر پورا تصرف حاصل تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے اس چیونٹی کو اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور پوچھا" بتا! تیری سلطنت وسیع ہے یا میری؟"

چیونٹی نے کہا" کس کی سلطنت پُرعظمت ہے یہ اللہ کو معلوم ہے مگر میں یہ بات جانتی ہوں کہ اس وقت میرا تخت سلیمانؑ کا ہاتھ ہے۔"

فرماں روا چیونٹی

حضرت سلیمانؑ حضرت داؤدؑ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۹۶۵ قبل مسیح میں حضرت داؤدؑ کے جانشین ہوئے اور تقریباً چالیس سال فرماں روا رہے۔ حضرت سلیمانؑ کو اللہ نے حیوانات کی بولیاں سمجھنے کا علم عطا کیا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ جن و انس اور حیوانات کے عظیم الشان لشکر کے جلوس میں کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے۔ لشکر کی کثرت کے باوجود کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ اپنے درجے اور رتبے کے خلاف آگے پیچھے ہو کر بے ترتیبی کا مرتکب ہو سکے۔ سب فرماں بردار لشکریوں

کی طرح حضرت سلیمانؑ کی عظمت اور ہیبت سے اپنے اپنے قرینے سے فوج در فوج چل رہے تھے کہ لشکر چلتے چلتے ایسی وادی میں پہنچا جہاں چیونٹیاں بے شمار تھیں اور پوری وادی ان کا مسکن بنی ہوئی تھی۔ چیونٹیوں کے بادشاہ نے لشکر کے اس کثیر انبوہ کو دیکھ کر اپنی رعایا سے کہا" تم فوراً اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ سلیمان اور ان کے لشکر کو کیا معلوم کہ تم اس کثرت سے وادی کی زمین پر رینگ رہی ہو۔ نہ معلوم ان کے گھوڑے اور پیادوں کے قدموں کے نیچے تم میں سے کتنی تعداد بے خبری میں روندی جائے۔"

اللہ نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:-

" اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم بخشا اور ان دونوں نے کہا۔ تعریف ہے اللہ کے لئے جس نے ہم کو بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔ اس نے کہا اے لوگو، ہمیں پرندوں کی بولیوں کا علم دیا گیا ہے اور ہمارے لئے ہر شے مہیا کر دی گئی ہے۔ بے شک یہ کھلا ہوا فضل ہے۔ اور جمع ہوا لشکر سلیمان کے لئے جن وانس اور پرندوں کا اور وہ درجہ بدرجہ ایک نظم وضبط کے ساتھ آگے پیچھے چل رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ وادیِ نمل میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور ان کا لشکر تم کو روند ڈالے۔ چیونٹی کی یہ بات سن کر سلیمان ہنس پڑے اور کہا۔ اے پروردگار! مجھ کو توفیق دے کہ میں تیرا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر انعام کیا ہے اور یہ کہ میں نیک عمل کروں جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک

بندوں میں داخل فرما۔"

چیونٹیوں جیسی ننھی مخلوق کا اپنا ایک طرزِ معاشرت ہے۔ اس ننھے سے حشرات الارض میں وہ تمام نظامہائے زندگی موجود ہیں جو حضرت انسان کی زندگی میں داخل ہیں۔ چیونٹیوں کا خاندان ہزاروں افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں مختلف شکل اور رنگ روپ کی چیونٹیاں ہوتی ہیں۔ پورے خاندان میں ایک ملکہ ہوتی ہے۔ پوری آبادی میں اس کا حکم چلتا ہے اور ہر رکن اس کے حکم کا پابند ہوتا ہے۔ آبادی میں فنکار چیونٹیاں بھی ہوتی ہیں، انجینیئرز بھی ہوتے ہیں، ماہر باغبانی بھی ہوتے ہیں اور ان کی فوج بھی ہوتی ہے۔ ان میں ایثار و قربانی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے۔ تمام اراکین اپنے فرائض مکمل طور پر انجام دیتے ہیں۔ چیونٹیوں میں نر (MALE) اور مادہ (FE MALE) دونوں ہوتی ہیں۔ لیکن ملکہ کے سوا کوئی اور چیونٹی تولید کا کام انجام نہیں دے سکتی۔ اگر اتفاقاً ملکہ مر جائے تو شہد کی مکھی کی طرح نئی ملکہ کا تقرر نہیں ہوتا بلکہ دوسری کالونی میں ضم ہو جاتی ہیں۔ چیونٹیوں کی کالونی تقسیم کار کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ مختلف شکل و صورت کی چیونٹیوں میں کام منقسم ہوتا ہے اور سب فرائض کی تکمیل پوری دیانت سے انجام دیتی ہیں۔ کارکن غذا مہیا کرنے اور نئی نسل کی پرورش اور دیکھ بھال کرنے کا کام کرتے ہیں۔ مزدور باربرداری کا کام کرتے ہیں۔ نر تناسل کا کام انجام دیتے ہیں اور ان کا وجود اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک ملکہ حاملہ نہ ہو جائے۔ اس کے بعد یہ رفتہ رفتہ ختم ہو جاتے ہیں۔

شہد بھری چیونٹی | چیونٹی کی ایک قسم شہد کی چیونٹی (HONEY ANT) ہوتی

ہے جو پھلوں کا رس اپنے پیٹ میں جمع کر لیتی ہے اور اس کے بعد وہ اپنے گھر میں الٹی لٹک جاتی ہے۔ دوسری چیونٹیاں، ملکہ اور بچے اس کا رس چاٹتے ہیں اور یہ بے چاری جذبۂ ایثار و الفت میں معلق رہتی ہے تاوقتیکہ تمام شہد ختم نہ ہو جائے۔

باغبان چیونٹیاں | ایک قسم باغبان چیونٹیوں کی ہوتی ہے جو باغ لگاتی ہیں۔ یہ باغ پھپھوند کے ہوتے ہیں۔ یہ کمال مہارت سے باغوں کی افزائش اور پرداخت کرتی ہیں۔ یہ باغ مکان کی گیلریوں اور خانوں میں لگائے جاتے ہیں۔ چیونٹیوں کے لئے یہ باغ پھلوں کے باغات کا کام کرتے ہیں، اس لئے کہ چیونٹیاں ان باغات کو غذا کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ یہ غذا آبادی کے تمام افراد استعمال کرتے ہیں۔

مزدور چیونٹیاں | مزدور چیونٹیاں غلہ جمع کرتی ہیں اور اس کو خانوں میں ذخیرہ کرتی جاتی ہیں جو ضرورت پڑنے پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یہ مزدور چیونٹیاں اتنی محنتی ہوتی ہیں کہ بعض اوقات اپنے جسم سے دس گنا وزن اٹھا کر لے آتی ہیں۔

انجینیئر چیونٹیاں | انجینیئر چیونٹیاں اپنی ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ یہ درمیان میں ایک بڑا سا کمرہ بناتی ہیں جو شاہی محل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کمرہ انتہائی صاف ستھرا رکھا جاتا ہے۔ اس میں ملکہ قیام کرتی ہے۔ مزدور اور کارکن دونوں ملکہ کی خدمت گزاری میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ شاہی محل گیلریوں کے ذریعے ہر طرف سے ملا ہوتا ہے۔ ان گیلریوں

میں جگہ جگہ عام خانے ہوتے ہیں جن میں یا تو غذا کا ذخیرہ ہوتا ہے یا مزدور کارکن رہتے ہیں۔ ان کا قلعہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اس پر پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور شدید تپش بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

درزی چیونٹیاں

چیونٹیوں میں ماہر درزی بھی ہوتی ہیں۔ یہ زیادہ تر جنگلوں میں رہتی ہیں اور درختوں پر بسیرا کرتی ہیں۔ ان کے کارکن بڑی مہارت سے پتوں کا کویہ (COCOON) بنا کر انڈوں سے نکلنے والے چھوٹے کیڑے (لاروے) ان میں حفاظت سے رکھ دیتے ہیں اور اس طرح یہ پرندوں کے حملوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ چیونٹیاں سینے پرونے میں اس قدر ماہر ہوتی ہیں کہ ان کی جوڑی ہوئی کوئی چیز ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کسی ماہر درزی نے سلائی کی ہو۔

سائنس داں چیونٹیاں

ایک قسم فوجی چیونٹیوں کی ہوتی ہے جو زیادہ تر خانہ بدوش ہوتی ہیں۔ ان کے طور طریق فوجیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ جس طرح فوجی زندگی کیمپ اور جنگلوں میں بسر ہوتی ہے، اسی طرح کا طرزِ رہائش ان کا بھی ہے۔ یہ چیونٹیاں ایک قافلے کی شکل میں سفر کرتی ہیں۔ ملکہ اپنے مصاحبین کے وسط میں ہوتی ہے۔ دن بھر یہ قافلہ رواں دواں رہتا ہے اور جو کیڑا ان کے راستے میں حائل ہوتا ہے، محافظ چیونٹیاں انہیں ہلاک کر دیتی ہیں۔ رات کے وقت کسی درخت پر ایک ستون کی شکل میں جمع ہو جاتی ہیں۔ ان کے اکٹھے ہونے کا انداز بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ ملکہ اور اس کے مصاحبین وسط میں ہوتے ہیں۔ ارد گرد کارکن اور سپاہی ہوتے ہیں۔ اکٹھے

ہوتے وقت یہ گیلریوں کی طرح درمیان میں راستہ چھوڑتی جاتی ہیں تاکہ ہوا کا گزر ہو سکے۔ گویا تنفس (RESPIRATION) کے سائنسی اصولوں سے بھی واقف ہوتی ہیں۔ رات بھر اسی طرح آرام کرتی ہیں اور سورج طلوع ہوتے ہی ان میں سے ایک درجن چیونٹیاں علیحدہ ہو جاتی ہیں اور چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ ان کے چلتے ہی دوسری چیونٹیاں بھی ان کے ہمراہ روانہ ہو جاتی ہیں اور اس طرح یہ قافلہ پھر رواں دواں ہو جاتا ہے۔

ٹائم اسپیس سے آزاد چیونٹی

چیونٹیوں میں ایک قسم ایسی چیونٹیوں کی ہوتی ہے جن میں ہوا میں تحلیل ہونے اور فاصلوں کو حذف کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ سائنس دانوں کے سیکڑوں تجربات کی روشنی میں یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ ان چیونٹیوں میں ہوا میں تحلیل ہونے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

انڈے دینے کا وقت آتا ہے تو ملکہ کا جسم بڑا ہو جاتا ہے۔ پھر مصاحبین اور کارکن ملکہ کی زیادہ خدمت کرنے لگتے ہیں۔ اور ملکہ کے انڈے دینے کے بعد نئی آبادی ظہور میں آتی ہے۔ ملکہ چھ سات دنوں میں بیس سے تیس تک انڈے دیتی ہے جن کو کارکن بڑی مستعدی سے ملکہ کے جسم سے علیحدہ کرتے ہیں اور پھر ان انڈوں کو ایک جگہ حفاظت سے رکھ دیا جاتا ہے۔ چند دنوں میں انڈوں سے چھوٹے چھوٹے کیڑے نکل آتے ہیں اور آہستہ آہستہ بالغ چیونٹیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جہاں تک ملکہ کا تعلق ہے، تقریباً نصف درجن انڈے ایسے ہوتے ہیں جن کی دیکھ بھال کارکن خصوصی طور پر کرتے ہیں۔ ان میں پانچ چھ ملکائیں

نکلتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں پرانی آبادی کے افراد چھ یا سات حصوں میں تقسیم ہو کر ملکہ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر ملکہ کے کارکن اطاعت گزاری اور خدمت گزاری میں انتہا کر دیتے ہیں۔

یہ ننھا سا حشرہ (INSECT) اس قدر نظم وضبط اور تعاون سے کس طرح کام کرتا ہے۔ اس کو نظم وضبط اور تعاونِ باہمی سے رہنے کا طریقہ قدرت انسپائر (INSPIRE) کرتی ہے۔ اس نظم وضبط کو کسی طرح بھی عقل وشعور کے دائرے سے باہر نہیں کہا جا سکتا۔

قاصد پرندہ

آسمانی کتابوں میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس واقعے میں بھی ایک پرندے کی دانش مندی کا تذکرہ آیا ہے۔

حضرت سلیمانؑ کے عظیم الشان اور بے مثال دربار میں انسانوں کے علاوہ جن اور حیوانات بھی درباری خدمات کے لئے حاضر رہتے تھے اور اپنے مراتب اور سپرد کردہ خدمات پر بلا چون وچرا عمل کرتے تھے۔

دربارِ سلیمان علیہ السلام پورے جاہ وحشم کے ساتھ منعقد تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے ہُدہُد کو غیر حاضر دیکھ کر فرمایا۔ "میں ہُدہُد کو موجود نہیں پاتا۔ کیا وہ واقعی غیر حاضر ہے۔ اگر اس کی غیر حاضری بے وجہ ہے تو میں اس کو سخت سزا دوں گا یا ذبح کر ڈالوں گا یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی کوئی معقول وجہ بتائے۔"

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہُدہُد پرندہ حاضر ہو گیا۔ اور حضرت سلیمانؑ کی باز پرس پر اس نے کہا۔ "میں ایسی خبر لایا ہوں جس کی اطلاع آپ کو نہیں ہے۔

وہ یہ ہے کہ یمن کے علاقے میں سبا کی ملکہ رہتی ہے اور خدا نے اُسے سب کچھ دے رکھا ہے اور اس کا تختِ سلطنت اپنی خوبیوں کے اعتبار سے عظیم الشان ہے۔ ملکہ اور اس کی قوم آفتاب پرست ہے۔ شیطان نے انہیں گمراہ کر دیا ہے اور وہ خدائے لاشریک کی پرستش نہیں کرتے۔"

حضرت سلیمانؑ نے کہا۔ "تیرے سچ اور جھوٹ کا امتحان ابھی ہو جائے گا۔ تو اگر سچا ہے تو میرا یہ خط لے جا اور اس کو سبا والوں تک پہنچا دے اور انتظار کر کہ وہ اس کے متعلق کیا گفتگو کرتے ہیں۔"

ہُدہُد جب یہ خط لے کر پہنچا تو ملکہ آفتاب پرستی کے لئے جا رہی تھی۔ ہُدہُد نے راستے ہی میں یہ خط ملکہ کے سامنے ڈال دیا۔ جب یہ خط گرا تو ملکہ نے اٹھا کر پڑھا اور اپنے درباریوں سے کہا۔ "ابھی میرے پاس ایک مکتوب آیا ہے جس میں درج ہے کہ یہ خط سلیمانؑ کی جانب سے اور اللہ کے نام سے شروع ہے جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔ تم کو ہم سے سرکشی اور سربلندی کا اظہار نہ کرنا چاہیئے اور تم میرے پاس خدا کی فرماں بردار بن کر آؤ۔"

ملکۂ سبا نے خط کی عبارت پڑھ کر کہا۔ "اے میرے اراکین سلطنت! تم جانتے ہو کہ میں اہم معاملات میں تمہارے مشورے کے بغیر کبھی اقدام نہیں کرتی، اس لئے اب تم مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

اراکین حکومت نے عرض کیا۔ "جہاں تک مرعوب ہونے کا تعلق ہے، اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ہم زبردست طاقت اور جنگی قوت کے مالک ہیں رہا مشورے کا معاملہ تو آپ جو چاہیں، فیصلہ کریں۔ ہم آپ کے فرماں بردار ہیں۔"

ملکہ نے کہا۔ "جس عجیب طریقے سے سلیمانؑ کا پیغام ہم تک پہنچا ہے وہ ہمیں اس بات کا سبق دیتا ہے کہ سلیمانؑ کے معاملے میں سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھایا جائے۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ چند قاصد روانہ کروں اور وہ سلیمانؑ کے لئے عمدہ اور بیش قیمت تحائف لے جائیں۔"

جب ملکہ سبا کے قاصد تحائف لے کر حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا۔ "تم اپنے تحائف واپس لے جاؤ اور اپنی ملکہ سے کہو کہ اگر اس نے میرے پیغام کو قبول نہیں کیا تو میں عظیم الشان لشکر کے ساتھ سبا والوں تک پہنچوں گا اور تم اس کی مدافعت اور مقابلے سے عاجز رہو گے۔"

قاصد نے واپس آکر ملکہ سبا کے سامنے صورتِ حال بیان کر دی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظمت و شوکت کا جو منظر دیکھا تھا، حرف بہ حرف کہہ سنایا اور بتایا کہ ان کی حکومت صرف انسانوں ہی پر نہیں ہے بلکہ جنّات اور حیوانات بھی ان کے تابع فرمان اور مسخّر ہیں۔

ملکہ نے جب یہ سارے احوال سنے تو اس نے طے کر لیا کہ حضرت سلیمانؑ کی آواز پر لبیک کہنا ہی مناسب ہے چنانچہ وہ ان کی خدمت میں روانہ ہو گئی۔ سلیمانؑ کو معلوم ہو گیا کہ ملکہ سبا حاضر خدمت ہو رہی ہے۔ انہوں نے اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا کے یہاں پہنچنے سے پہلے اس کا تختِ شاہی اس دربار میں موجود ہو۔"

لہروں پر سفر

ایک دیو پیکر جن نے کہا۔ "آپ کے دربار برخاست کرنے سے پہلے ہی میں تخت لا سکتا ہوں۔" جن کا دعویٰ سُن کر

ایک انسان نے جس کے پاس آسمانی کتاب کا علم تھا، یہ کہا۔ "اس سے پہلے کہ آپ کی پلک جھپکے یہ تخت میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔"

سلیمانؑ نے رُخ پھیر کر دیکھا تو دربار میں ملکہ سبا کا تخت موجود تھا۔ تخت کے دربار میں آ چکنے کے بعد سلیمانؑ نے حکم دیا کہ اس تخت کی ہیئت میں کچھ تبدیلی کر دی جائے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا یہ دیکھ کر حقیقت کی راہ پاتی ہے یا نہیں۔

کچھ عرصے بعد ملکہ سبا حضرت سلیمان علیہ السّلام کی خدمت میں باریاب ہو گئی اور جب دربار میں حاضر ہوئی تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے۔ عقلمند ملکہ نے جواب دیا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہی ہے۔" ملکۂ سبا نے اس کے ساتھ ہی یہ کہا۔ "مجھ کو آپ کی بے نظیر اور عدیم المثال قوت کا پہلے سے علم ہو چکا ہے۔ اس لئے میں مطیع اور فرمان بردار بن کر حاضر خدمت ہوئی ہوں اور اب تخت کا یہ محیر العقول معاملہ تو آپ کی لاثانی طاقت کا تازہ مظاہرہ ہے اور ہماری اطاعت کیلئے مزید تازیانہ۔ اس لئے ہم پھر آپ سے فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہیں۔"

سلیمان علیہ السّلام نے جنّات اور انسان انجینئروں سے ایک عالی شان محل تعمیر کروایا تھا جو آبگینوں کی چمک، قصر کی رفعت اور عجیب و غریب دستکاری کی وجہ سے بے مثال تھا۔ اس میں داخل ہونے کے لئے سامنے جو صحن پڑتا تھا اس میں ایک بڑا حوض کھدوا کر پانی سے لبریز کر دیا تھا۔ اور پھر شفاف آبگینوں اور بلّور کے ٹکڑوں سے ایسا نفیس فرش بنایا تھا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دھوکہ کھا کر یہ یقین کر لیتی تھی کہ صحن میں شفاف پانی بہہ رہا ہے۔

ملکۂ سبا سے کہا گیا کہ وہ قصرِ شاہی میں قیام کرے۔ ملکہ محل کے سامنے پہنچی تو شفاف پانی بہتا ہوا پایا۔ یہ دیکھ کر پانی میں اترنے کے لئے کپڑوں کو پنڈلیوں سے اوپر اٹھایا تو سلیمان علیہ السلام نے فرمایا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پانی نہیں ہے۔ سارا محل اور اس کا خوبصورت صحن چمکتے ہوئے آبگینوں سے بنایا گیا ہے۔"

شرم سے ملکہ کی آنکھیں نیچی ہوگئیں۔ اس کی فہم اور دانش مندی پر یہ ایک زبردست چوٹ تھی۔ اس کے لاشعور میں چھپی ہوئی نخوت اور بڑائی نے ندامت سے سر جھکالیا۔ ملکہ نے ایک نادم اور شرمسار انسان کی طرح سلیمانؑ کے سامنے بارگاہِ الٰہی میں اقرار کیا۔

"اے پروردگار! آج تک ماسوا اللہ کی پرستش کرکے میں نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے۔ مگر اب میں سلیمانؑ کے ساتھ ہوکر صرف ایک خدا پر ایمان لاتی ہوں جو تمام کائنات کا پروردگار ہے۔"

ہزارہا مثالوں میں سے یہ چند مثالیں جو پیش کی گئی ہیں ان سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ انسان کی طرح دوسری تمام مخلوق یعنی پرندے، چرندے، درندے، جنات اور حشرات الارض بھی عقل و شعور رکھتے ہیں۔

ایجادات کا قانون

اللہ نے فرمایا: "ہم نے داؤد اور سلیمان کو ایک علم دیا جو اللہ کی طرف سے انسپائر (INSPIRE) ہوا ہے۔"

انسپائر ہونا خواہ وہ سن کر ہو یا کوئی منظر دیکھ کر ہو، بہرصورت وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ چوں کہ اللہ کے پیغمبروں پر وحی کے ذریعے علم کا نزول ہوتا ہے، اس لئے اللہ کی طرف سے ذہن میں کوئی خیال آتا ہے تو وہ اللہ ہی کا علم ہوتا ہے۔

مختلف سائنسی ایجادات مثلاً ہوائی جہاز، کمپیوٹر، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون وغیرہ کی ایجاد بھی اس وقت ممکن ہوئی جب لوگوں کو اللہ کی طرف سے نئی نئی ایجادات و اختراعات کا علم انسپائر کیا گیا، اس لئے کہ بغیر علم کے کسی چیز کا وجود زیرِ بحث نہیں آتا۔ انسان کو وہ چیز مل جاتی ہے جس کی اُسے تلاش ہوتی ہے۔ اللہ کے یہاں اس بات کی خصوصیت نہیں کہ وہ اللہ کو مانتا ہے یا نہیں۔

اللہ کی سنّت

قانون یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کے ساتھ تن من دھن سے کسی چیز کی تلاش میں لگ جائے اور تلاش کو زندگی کا مقصد قرار دے لے تو وہ چیز اسے حاصل ہوجاتی ہے۔ یہ اللہ کی سنّت ہے۔ پہلے بھی جاری تھی، اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔

اسی بات کو ہمارے بزرگوں نے دو لفظوں میں بیان کیا ہے۔ "جوئندہ یابندہ"۔

بہت سے لوگوں نے زمین کے اندر موجود دھات یورینیم (URANIUM) کی تلاش شروع کی۔ لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ لیکن وہ لگن کے ساتھ اس کام میں مصروف رہے۔ اور ایک دن انہوں نے یورینیم کو پالیا۔ یہ وہی دھات ہے جو ایٹم بم کی تیاری میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔

قرآن اور دیگر آسمانی صحائف میں اللہ نے حضرت سلیمانؑ کے واقعے میں صرف کہانی بیان نہیں کی کہ کہانیاں سنا کر ہمیں مرعوب کرے۔ اللہ ہمیں کیا مرعوب کرے گا، ہماری حیثیت اور حقیقت ہی کیا ہے؟ اللہ کے علوم لامتناہی ہیں۔ اللہ کا منشا یہ ہے کہ ہم لوگوں کو آگے بڑھتا دیکھ کر خود بھی قدم بڑھائیں۔ اس کہانی کا منشا یہ ہے کہ ہم بھی ہدایت کی راہ اختیار کریں۔ اللہ نے اس ضمن میں جنات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ جنات انسانوں کے زیرِ اثر آسکتے ہیں۔ اگر لوگ اس علم کو آسمانی کتابوں میں تلاش کریں جس کو علم الکتاب کہا گیا ہے تو یقیناً وہ علم انہیں مل جائے گا جو انسان کو نہ صرف جنات پر بلکہ پوری کائنات پر فوقیت دیتا ہے۔

لازمانیت (TIMELESSNESS)

ہُدہُد کا دیر سے آنا اور سلیمانؑ کو ملکۂ سبا کے متعلق اطلاع دینا اور یہ بتانا کہ وہ اور اس کی قوم آفتاب پرست ہے اور ہُدہُد کا پیغام لے کر جانا، یہ سب باتیں نکات سے خالی نہیں ہیں۔ ان باتوں میں اللہ کی حکمت پوشیدہ ہے۔

پہلی حکمت تو یہ ہے کہ سلیمانؑ جو انسان تھے انسانوں، جنات، پرندوں،

چرندوں اور درندوں پر حکومت کرتے تھے۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی سرکشی کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا اور اگر سرکشی کرتا تو اسے سزا دی جاتی جیسا کہ سلیمانؑ نے ہُدہُد کے لئے کہا تھا۔

تیسری حکمت یہ ہے کہ باوجود اتنے بڑے لشکر کے جس میں جنات، انسان، پرندے وغیرہ شامل تھے، اللہ انہیں اس تمام لشکر کی شکم پری کے لئے رزق فراہم کرتا تھا۔

اس قصے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں ایک ایسا جن بھی تھا جو ایک یا دو ساعت میں ملکۂ سبا کا تخت یمن سے بیت المقدس لا سکتا تھا۔ یمن اور بیت المقدس کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ ہزار میل ہے۔

اس قصے سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انسان کی رسائی جنات سے بھی زیادہ ہے کیوں کہ وہ کتاب کا علم رکھتا ہے، حتیٰ کہ ایک ایسا ہی انسان علم کے زور پر ملکہ کا تخت ایک آن میں لے آیا۔ اللہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ آسمانی کتابوں میں وہ علم موجود ہے جس سے نوعِ انسانی ہر طرح کا استفادہ کر سکتی ہے۔ اس میں نبی ہونے کی کوئی شرط نہیں بلکہ ہر بندے کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے۔ کتاب کا علم سیکھ کر بندہ ایسی مسند پر قیام فرما ہو جاتا ہے جہاں اسے کائنات میں تصرّف کرنے کی صلاحیت ودیعت کر دی جاتی ہے۔

اس صلاحیت کو اگر کوئی بندہ ٹھکرا دے اور سمجھے کہ میری کیا حقیقت ہے کہ میں اس علم کو سمجھ سکوں، تو یہ غلط ہے اس لئے کہ اللہ نے سلیمانؑ کے قصے میں بندے کا تذکرہ کر کے یہ صلاحیت عام کر دی ہے بشرطیکہ وہ تفکر سے کام لے اور اُسے

تلاش کرے۔

یہ قانون بیان کر کے پیغمبروں کی فضیلت کم کرنا ہمارا منشا نہیں ہے۔ پیغمبر اللہ کے منتخب اور نوعِ انسانی کا جوہر ہوتے ہیں۔ اور نوعِ انسانی کے تمام علوم کا مخزن و منبع بھی اللہ کے فرستادہ پیغمبر ہیں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ نوعِ انسانی کا ہر فرد پیغمبروں کے علم سے استفادہ کر کے ماورائی دنیا میں تصرف کر سکتا ہے۔

جبلّی اور فطری تقاضے

انسان دو تقاضوں سے مرکب اور محرک ہے۔ ایک تقاضا جبلّی ہے اور دوسرا فطری۔ جبلّی تقاضے پر ہم با اختیار ہیں اور فطری تقاضے پر ہمیں کسی حد تک تو اختیار ہے مگر اس ارادے کو کلیتاً رد کرنے پر اختیار نہیں رکھتے۔ یہ ایک نظام ہے جو جبلّت اور فطرت پر قائم ہے۔ جبلّت میں ہر نوع اور ہر نوع کا ہر فرد ایک دوسرے سے محسوساتی رشتہ رکھتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جس طرح ایک ماں اپنے بچے سے پیار کرتی ہے اور اپنے بچے کی تربیت کر کے اُسے پروان چڑھاتی ہے، اسی طرح ایک بلّی بھی اپنے بچے سے محبت کرتی ہے، اپنے بچے کی تربیت کرتی ہے اور گرم و سرد سے اپنے بچے کی حفاظت کرتی ہے۔ مرغی جو زمین پر چلنے والا ایک پرندہ ہے، وہ بیک وقت اپنے کئی کئی بچوں کو اپنے ساتھ رکھتی ہے اور ہر طرح سے ان کی حفاظت اور تربیت کرتی ہے۔ ماں کوئی بھی ہو وہ مرغی ہو، کبوتر ہو، شیرنی ہو، بکری ہو ماں تا کا جذبہ تمام نوعوں میں مشترک ہے۔ جبلّت میں کوئی بھی فرد اپنے ارادے اور اختیار سے تبدیلی کر سکتا ہے لیکن

فطرت میں کسی نوع کا کوئی فرد تبدیلی نہیں کر سکتا۔ پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ پیدائش کے بعد بھوک پیاس کا تقاضا بھی ایک فطری عمل ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی، کوئی فرد خواہ زمین کے کسی خطے پر موجود ہو، اس بات پر اختیار نہیں رکھتا کہ وہ ساری زندگی کچھ نہ کھائے، ساری زندگی سوتا رہے یا جاگتا رہے۔ ہر آدمی یا ہر نوع کا ہر فرد جس طرح کھانا کھانے اور پانی پینے پر مجبور ہے اسی طرح سونے اور جاگنے پر بھی مجبور ہے۔ اس توجیہہ کے پیشِ نظر یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ افرادِ کائنات میں ہر فرد جبلّت اور فطرت کے اعتبار سے آپس میں ایک ذہنی ارتباط رکھتا ہے اور ایک مشترک رشتے میں منسلک ہے۔ جب ہم فطرت اور جبلّت کا گہرائی میں مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک نیا شعور حاصل ہوتا ہے۔ یہ شعور انسان اور جنات کے علاوہ کسی دوسری نوع کو حاصل نہیں ہے۔ جب انسان کے اندر سوچ اور تفکر کا یہ شعور متحرک ہو جاتا ہے تو اس کی نظر، اس کی فہم، اس کا ادراک اور اس کی بصیرت اُسے لازماً اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ با اختیار انسان مجبورِ محض بھی ہے۔ اور یہ مجبور ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری تمام زندگی کا کنٹرول کسی ایسی ہستی کے ہاتھ میں ہے جس کا اختیار کائنات کے اوپر محیط ہے۔ مذاہب اس ہستی کے مختلف نام رکھتے ہیں۔

اسلام اس ہستی کو اللہ کے نام سے متعارف کراتا ہے۔ عیسائیت اس عظیم اور دبدبے والی ہستی کو گاڈ (GOD) کا نام دیتی ہے، ہندومت اس بزرگ و برتر ہستی کو بھگوان کہتا ہے۔ کوئی یزداں اور کوئی میاں کہہ کر پکارتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر مذہب اس عظیم ہستی سے متعارف کرانے کا کوئی نہ کوئی اسلوب ضرور رکھتا ہے۔

استغنا

غور و فکر کیا جائے تو سوچنے اور سمجھنے کے کئی رُخ متعین ہوتے ہیں۔ تفصیل میں جانے کے بجائے ہم دو رُخ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو علمی اعتبار سے مستحکم ذہن ہیں یعنی ایسا ذہن رکھتے ہیں جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارا یقین ہے کہ ہر چیز، اس کی دنیا میں کوئی بھی حیثیت ہو، چھوٹی ہو یا بڑی، راحت ہو یا تکلیف سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کے مشاہدے میں یہ بات آجاتی ہے کہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے، جو ہو رہا ہے جو ہو چکا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے اس کا براہ راست تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔ یعنی جس طرح اللہ کے ذہن میں کسی چیز کا وجود ہے اسی طرح اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ فلسفیانہ طرز فکر کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم اس بات کو چند مثالوں پر پیش کرتے ہیں۔

زندگی کا ہر عمل اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ اس حیثیت میں معانی پہنانا دراصل طرزِ فکر میں تبدیلی ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ ہر چیز جس کا وجود اس دنیا میں ہے یا آئندہ ہوگا، وہ کہیں پہلے سے موجود ہے۔ یعنی دنیا میں کوئی چیز اس وقت تک موجود نہیں ہو سکتی جب تک وہ پہلے سے موجود نہ ہو۔ کوئی آدمی اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیدا ہونے سے پہلے کہیں موجود ہوتا ہے۔ آدمی زندگی کے نشیب و

فراز، دن اور ماہ و سال کے وقفے پہلے سے ایک فلم کی صورت میں ریکارڈ ہیں۔ اس فلم کو ہم "کائناتی فلم یا" لوحِ محفوظ" کہتے ہیں۔

کائناتی فلم

ایک آدمی جب عاقل، بالغ اور باشعور ہوتا ہے تو اسے زندگی گزارنے کے لئے وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے اور وسائل کو حاصل کرنے کے لئے روپیہ پیسہ ایک میڈیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ بات کچھ اس طرح ہے کہ ایک آدمی کے لئے پیدا کرنے والی ہستی نے ایک لاکھ روپے متعین کر دیے اسی طرح جیسے ایک لاکھ روپے کسی بنک میں جمع کر دیے جاتے ہیں۔ وسائل کو استعمال کرنے کے لئے آدمی کوشش اور جدوجہد کرتا ہے۔ کوشش اور جدوجہد جیسے جیسے کامیابی کے مراحل طے کرتی ہے اس کو روپیہ ملتا رہتا ہے۔ اور ضرورت پوری ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ اگر کائناتی فلم (لوحِ محفوظ) میں وسائل کا ریکارڈ اور زرِ مبادلہ متعین نہ ہو تو ڈسپلے (DISPLAY) ہونے والی فلم نامکمل رہتی۔ ایک آدمی کے نام سے بنک میں کروڑوں روپے کا زرِ مبادلہ موجود ہے لیکن وہ اسے نہ استعمال کرتا ہے اور نہ ہی اس طرف متوجہ ہوتا ہے تو یہ زرِ مبادلہ اس کے کام نہیں آتا۔

ایک طرزِ فکر یہ ہے کہ ایک آدمی باوجود اس کے کہ ضمیر ملامت کرتا ہے اپنی روزی حرام طریقے سے حاصل کرتا ہے۔ رزقِ حلال سے بھی دو روٹی کھاتا ہے اور رزقِ حرام سے بھی وہ شکم سیری کرتا ہے۔ لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ اس دنیا میں اسے جو کچھ مل رہا ہے وہ پہلے سے فلم کی صورت میں موجود ہے۔
ایک آدمی محنت مزدوری کر کے ضمیر کی روشنی میں روپیہ حاصل کرتا ہے۔

دوسرا آدمی ضمیر کی ملامت کی پروا نہ کرتے ہوئے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اُسے وہ ہی روپیہ مل رہا ہے جو لوحِ محفوظ پر اس کے لئے جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے اور انتہائی درجہ نادانی ہے کہ ایک آدمی اپنی ہی حلال چیز کو حرام کر لیتا ہے۔

ظرف اور مقدر

ایک مرتبہ حضرت علی رضؓ اپنے گھوڑے پر سوار کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ گھوڑے سے اترے۔ قریب سے ایک بدّو گزرا۔ اسے آواز دے کر بلایا اور کہا "تھوڑی دیر کے لئے گھوڑے کی لگام پکڑو۔ میں اتنے میں نماز ادا کر لوں۔"

بدّو نے حامی بھر لی۔ اور حضرت علی رضؓ نے نماز کی نیت باندھ لی۔ حضرت علی رضؓ نماز قائم کر کے دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ بدّو نے سوچا موقع اچھا ہے۔ گھوڑا ہضم کرنا تو مشکل تھا۔ لگام لے کر چلتا بنا۔ آپ جب نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ گھوڑا موجود ہے لیکن لگام اور بدّو دونوں غائب ہیں۔ اتنے میں آپ کے خادم قنبر کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ نے انہیں دو درہم دیکر کہا۔ بازار سے ایک لگام خرید لاؤ۔"

قنبر بازار پہنچے تو دیکھا کہ ایک بدّو لگام لئے کسی خریدار کا منتظر ہے۔ قنبر نے لگام کو پہچان لیا۔ اور بدّو کو پکڑ کر حضرت علی رضؓ کی خدمت میں لے آئے آپ نے پوچھا "اسے کیوں پکڑ لائے ہو؟"

قنبر نے جواب دیا "حضور! یہ آپ کے گھوڑے کی لگام ہے۔"

حضرت علی رضؓ نے پوچھا "یہ اس کی کیا قیمت مانگ رہا ہے؟"

قنبر نے جواب دیا۔ "دو درہم۔"

آپ نے ارشاد فرمایا "اسے دو درہم دے دو۔" اور فرمایا "میں نے یہ سوچ کر اسے لگام پکڑائی تھی کہ نماز سے فارغ ہو کر اسے خدمت کے عوض دو درہم دوں گا۔ یہ اس کا ظرف ہے کہ اس نے اپنا مقدر دوسری طرح لینا پسند کیا۔"

سات چور

شیخ رحؒ کو بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ یہ عجیب بات ہے کہ اللہ ہر وقت اپنا احسان جتاتا رہتا ہے۔ کبھی کہتا ہے میں کھلاتا ہوں، میں پلاتا ہوں۔ اور کبھی کہتا ہے میں ہی رزق فراہم کرتا ہوں۔ اگر ہم کھانا نہ کھائیں تو کوئی طاقت ہمیں کھانے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ یہ سوچ کر کھانا کھانا چھوڑ دیا۔ جب بیوی بچوں نے زیادہ پریشان کیا تو گھر چھوڑ کر ایک پرانے قبرستان میں وہ جا بیٹھے شام ہوئی تو ایک صاحب اپنی منت پوری کرنے کے لئے قبرستان میں موجود ایک مزار پر حاضر ہوئے۔ فاتحہ کے بعد انہوں نے شیخ کو بھی تبرک دیا۔ شیخ کے انکار اور اس شخص کے اصرار نے عجیب صورتِ حال پیدا کر دی۔ وہ شخص یہ سمجھ کر کہ شیخ کوئی دیوانے ہیں ایک پڑیا میں کچھ لڈو لپیٹے اور ایک جھاڑی کے نیچے رکھ دیئے کہ جب اس شخص کے حواس درست ہوں گے تو کھا لے گا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر گئی تو قبرستان میں چور داخل ہوئے اور انہوں نے چوری شدہ مال کی تقسیم شروع کی تو شیخ اُٹھ بیٹھے۔ چوروں کے کان کھڑے ہوئے اور آپس میں یہ طے پایا کہ یہ شخص کوئی مخبر ہے انہوں نے جلدی جلدی اپنا مال سمیٹ کر پوٹلی میں باندھ لیا اور شیخ پر سوالات کی بوچھار کر دی۔ شیخ کوئی معقول جواب نہیں دے سکے۔ اس تکرار میں چوروں میں سے ایک چور کی نظر جھاڑی کے نیچے رکھی ہوئی پڑیا پر پڑی۔ پڑیا کو کھول کر دیکھا تو

اس میں سات لڈو تھے۔ اور چور بھی اتفاق سے سات تھے۔ چوروں کا سردار بولا کہ یہ شخص بھی کوئی چور ہے اور بہت چالاک چور ہے۔ اس نے لڈوؤں میں زہر ملا دیا ہے تاکہ ہم سب کھا کر مر جائیں اور یہ ہمارے مال پر قبضہ کر لے۔ سردار نے کہا یہ سارے لڈو اسے کھلا دیے جائیں تاکہ اس کی سازش خود اس کو ہلاک کر دے۔ دو آدمیوں نے دونوں پیر پکڑے، دو آدمیوں نے دونوں ہاتھ پکڑے۔ ایک آدمی نے سر پکڑا، ایک آدمی سینے پر بیٹھ گیا اور ایک آدمی نے اُن کا منہ کھول کر اس میں لڈو ڈال دیا۔ جب شیخ نے اس حال میں بھی لڈو کھانا نہیں چاہا تو اس شخص نے زور زور سے تھپڑ رسید کیے اور انگلی کے ذریعے لڈو شیخ کے حلق میں اتار دیا۔ اس جبر و تشدد کے دوران ساتوں لڈو شیخ کے پیٹ میں پہنچ گئے۔ یہ کارنامہ انجام دینے کے بعد ساتوں چور سر پہ پیر رکھ کر بھاگ گئے۔

شیخ اٹھے اور بہت حسرت و یاس کے ساتھ انہوں نے جب آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو آواز آئی "اے مغرور بندے! گھر چلا جا، ورنہ روزانہ ہم اسی طرح کھلائیں گے۔"

ٹوکری میں حلوہ

ایک شخص بستی چھوڑ کر جنگل میں چلا گیا۔ ایک وقت، دو وقت بھوکا رہا کہ میں جب کھانا نہیں کھاؤں گا تو مجھے کون کھلائے گا۔ تیسرے وقت بھوک اور پیاس کی وجہ سے حالت غیر ہو گئی۔ دل میں خیال آیا کہ پانی پی لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ قریب ہی ایک نہر تھی۔ جب وہ شخص نہر کے قریب پہنچا تو پانی کے بہاؤ کے ساتھ ایک ٹوکری آتی ہوئی نظر آئی۔ تجسس پیدا ہوا کہ اس ٹوکری میں کیا ہے۔ ٹوکری کو کھولا تو اس میں ایک پرات تھی اور اس پرات میں

بہت سارا حلوہ رکھا ہوا تھا۔ یہ مغرور شخص نہایت بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے سارا حلوہ کھا گیا۔ حلوہ کھانے اور پانی پینے کے بعد اُسے خیال آیا کہ یہ حلوہ کہاں سے آیا۔ پانی کے بہاؤ کے خلاف نہر کے کنارے کنارے وہ چلتا رہا۔ اور بالآخر ایک گاؤں میں پہنچا۔ وہاں ایک کسان نے بتایا کہ وہ ٹوکری صبح بہت سویرے نمبردار نے نہر میں ڈالی تھی۔ پتہ نہیں اس میں کیا تھا۔ مغرور شخص نمبردار کے گھر پہنچا۔ نمبردار نے بتایا کہ رات ہمارے یہاں ایک فقیر آیا ہوا تھا۔ ہمارا ایک بھائی بیمار تھا۔ اور اس کے سارے جسم پر کوڑھ نکل آیا تھا۔ جسم کا تقریباً ہر حصہ گلنے لگا تھا اور خون پیپ رستا رہتا تھا۔ فقیر نے یہ علاج تجویز کیا کہ حلوہ پکا کر گرم گرم سارے جسم پر مل دیا جائے اور صبح منہ اندھیرے جسم پر سے سارا حلوہ الگ کر کے ٹوکری میں رکھ کر پانی میں بہا دیا جائے۔

استغناء کی دستاویز

راسخ فی العلم لوگوں کے ذہن میں یقین کا ایسا پیٹرن بن جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ہر عمل اور زندگی کی ہر حرکت، ہر ضرورت اللہ کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ یہی پیغمبروں کی طرزِ فکر ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ ہمارے لئے اللہ نے جو نعمتیں مخصوص کر دی ہیں، وہ ہمیں ہر حال میں میسر آئیں گی اور یہ یقین ان کے اندر استغناء کی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ قلندر بابا اولیاءؒ کا ارشاد ہے کہ استغنا بغیر یقین کے پیدا نہیں ہوتا اور یقین کی تکمیل بغیر مشاہدے کے نہیں ہوتی۔ اور جب آدمی کے اندر استغنا نہیں ہوتا اس آدمی کا تعلق اللہ سے کم اور مادی دنیا (اسفل) سے زیادہ رہتا ہے۔

روحانیت ایسے اسباق کی دستاویز ہے جن اسباق میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ سکون کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر استغنا ہو۔ استغنا کے لئے ضروری ہے کہ قادرِ مطلق ہستی پر توکل ہو۔ توکل کو مستحکم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر ایمان ہو اور ایمان کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر وہ نظر کام کرتی ہو جو نظر غیب میں دیکھتی ہے۔ بصورتِ دیگر کبھی کسی بندے کو سکون میسر نہیں آسکتا۔ آج کی دنیا میں عجیب صورتِ حال ہے کہ ہر آدمی دولت کے انبار اپنے گرد جمع کرنا چاہتا ہے اور یہ شکایت کرتا ہے کہ سکون نہیں ملتا ہے۔ سکون کوئی عارضی چیز نہیں ہے۔ سکون ایک کیفیت کا نام ہے جو یقینی ہے اور جس کے اوپر کبھی موت وارد نہیں ہوتی۔ ایسی چیزوں سے جو عارضی ہیں فانی ہیں اور جن کے اوپر ہماری ظاہری آنکھوں کے سامنے بھی موت وارد ہوتی رہتی ہے، ان سے کس طرح سکون مل سکتا ہے۔ استغنا ایک ایسی طرزِ فکر ہے جس میں آدمی فانی اور مادی چیزوں سے ذہن ہٹا کر حقیقی اور لافانی چیزوں میں تفکر کرتا ہے۔ یہ تفکر جب قدم قدم چلا کر کسی بندے کو غیب میں داخل کر دیتا ہے تو سب سے پہلے اس کے اندر یقین پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ہی یقین کی کرن دماغ میں پھوٹتی ہے وہ نظر کام کرنے لگتی ہے جو نظر غیب کا مشاہدہ کرتی ہے۔ غیب میں مشاہدے کے بعد کسی بندے پر جب یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات کی باگ ڈور ایک واحد ہستی کے ہاتھ میں ہے تو اس کا تمام تر ذہنی رجحان اس ذات پر مرکوز ہو جاتا ہے اور اس مرکزیت کے بعد استغنا کا درخت آدمی کے اندر شاخ در شاخ پھیلتا رہتا ہے۔

قومی اور انفرادی زندگی

کائنات کی تمام حرکات و سکنات ایک فلم کی صورت میں ریکارڈ ہیں۔ جس جس طرح اس فلم میں کائناتی مظاہر کے نقوش موجود ہیں اسی طرح بے شمار کہکشانی نظاموں میں نشر ہو رہے ہیں۔ بات جد و جہد، کوشش اور اختیار کی ہے اگر جد و جہد اور کوشش نہیں کی جاتی تو زندگی میں خلا واقع ہو جاتا ہے۔ یہ عمل انفرادی اور قومی دونوں صورتوں میں ازل تا ابد جاری ہے۔

اللہ کا قانون ہے کہ جب کوئی بندہ جد و جہد اور کوشش کرتا ہے اور اس جد و جہد اور کوشش کا ثمر کسی نہ کسی طرح اللہ کی مخلوق کے کام آتا ہے تو وسائل میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ زمین پر اللہ نے جتنی بھی اشیا تخلیق کی ہیں ان کے اندر بے شمار صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ کوشش سے جب ان اشیا کے اندر صلاحیتوں کو متحرک کر دیا جاتا ہے یا ان اشیا میں محفوظ مخفی صلاحیتوں کا کھوج لگا لیا جاتا ہے تو ایجادات کے بے شمار راستے کھل جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ نے لوہا تخلیق کیا۔ من حیث القوم یا انفرادی طور پر جب لوہے کی صفات اور لوہے کے اندر کام کرنے والی صلاحیتوں کا سراغ لگایا جاتا ہے تو لوہا ایک ایسی چیز بن کر سامنے آتا ہے جس میں لوگوں کے لئے بے شمار فائدے ہیں۔ آج کی سائنس اس کا کھلا ثبوت ہے۔ سائنسی ترقی میں مشکل سے کوئی ایسی چیز ملے گی جس میں کسی نہ کسی طرح لوہے کا عمل دخل نہ ہو۔

صورتِ حال کچھ یوں بنی کہ لوحِ محفوظ میں انفرادی زندگی بھی نقش ہے اور قومی زندگی بھی نقش ہے۔ انفرادی حدود میں کوئی بندہ جب کوشش اور جدو

جہد کرتا ہے تو اس کے اوپر انفرادی فوائد ظاہر ہوتے ہیں۔ قومی اعتبار سے ایک دو چار دس بندے جب کوشش کرتے ہیں تو اس جدوجہد اور کوشش سے پوری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اللہ کہتا ہے۔ "میں ان قوموں کی تقدیریں نہیں بدلتا جو قومیں خود اپنی حالت بدلنا نہیں چاہتیں"۔ لوحِ محفوظ پر یہ بات بھی نقش ہے کہ جو قومیں خود اپنی حالت بدلنے کے لئے کوشش کرتی ہیں ان کو ایسے وسائل مل جاتے ہیں جن سے وہ معزز اور محترم بن جاتی ہیں۔ اور جو قومیں اپنی تبدیلی نہیں چاہتیں وہ محروم اور ذلیل زندگی گزارتی ہیں۔

لوحِ محفوظ پر لکھے ہوئے نقوش یہ ہیں :

بندہ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات کو اگر صحیح سمتوں میں استعمال کرتا ہے تو اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اگر غلط طرزوں میں استعمال کرتا ہے تو منفی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ بندہ اللہ کے عطاکردہ اختیارات کو اس طرح استعمال کرے کہ جس سے اس کی اپنی فلاح اور اللہ کی مخلوق کی فلاح کا سامان میسر ہو۔ انفرادی فلاح اللہ کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی اس لئے کہ اللہ خالق ہے، رب ہے اور ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے انعامات اور اکرامات اور اللہ کے پیدا کئے ہوئے وسائل سے ساری مخلوق فائدہ اٹھائے۔ مختصراً اس بات کو اس طرح سمجھا جائے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب لوحِ محفوظ میں ریکارڈ ہے۔ اس فلم میں لوگوں کا عروج و زوال بھی لکھا ہوا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ قومیں اگر ان صحیح طرزوں میں عملی زندگی بسر کریں گی تو ان کو عروج نصیب ہوگا اور اگر غلط طرزوں میں عملی

زندگی بسر کریں گی تو غلام بنادی جائیں گی۔

انبیاء کی طرزِ فکر

ترقی اور تنزل جب زیرِ بحث آتا ہے تو ذہن اس طرف بھی متوجہ ہوتا ہے کہ آخر ترقی یا تنزل میں کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ ابھی ہم بتا چکے ہیں کہ انفرادی یا اجتماعی جدوجہد کے نتیجے میں ترقی نصیب ہوتی ہے اور انفرادی یا اجتماعی تساہل اور عیش پسندی کے نتیجے میں قوموں کو عروج کے بجائے زوال نصیب ہوتا ہے۔ ترقی کے یہی دو رُخ ہیں۔ ترقی یا عزت و توقیر کی ایک حالت یہ ہے کہ کسی فرد یا کسی قوم کو دنیاوی عزت اور دنیاوی دبدبہ اور دنیاوی شان و شوکت نصیب ہو۔ ترقی کا دوسرا رُخ جو فی الواقع حقیقی رُخ ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ظاہری حالت میں رہتے ہوئے غیب کی دنیا میں بھی جس فرد یا قوم کی رسائی ہوتی ہے، دراصل وہی اصلی ترقی، عزت اور شان و شوکت ہے۔ ان دو رخوں پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات پوری طرح سامنے آجاتی ہے کہ موجودہ دَور میں سائنسی ترقی کا دار و مدار صرف ظاہری ترقی پر ہے۔ بے شک وہ قومیں جنہوں نے علوم میں تفکر کیا ہے اور جدّ و جہد کے بعد نئی نئی اختراعات کی ہیں، وہ دنیاوی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہی ترقی یافتہ قومیں سکون اور اطمینان سے محروم ہیں۔ قلبی اطمینان اور رُوحانی سکون سے یہ قومیں اس لئے محروم ہیں کہ یہ حقیقت سے بے خبر ہیں یا حقیقی دنیا سے ابھی ان کا کوئی واسطہ یا تعلق پیدا نہیں ہوا۔ حقیقت میں ذہنی انتشار نہیں ہوتا، حقیقت کے اوپر کبھی خوف اور غم کے سائے نہیں منڈلاتے۔ حقیقی دنیا سے متعارف لوگ ہمیشہ پُرسکون رہتے ہیں۔ موجودہ دَور بے شک ترقی کا دَور

ہے لیکن اس ترقی کے ساتھ ساتھ جس قدر صعوبتیں، پریشانیاں، بے سکونی اور ذہنی انتشار سے نوعِ انسانی دوچار ہوئی ہے اس کی نظیر پہلے کے دور میں نہیں ملتی۔ وجہ صرف یہی ہے کہ اس ترقی کے پیچھے ذاتی منفعت ہے، وہ انفرادی ہو یا قومی ہو۔ اگر یہ ترقی فی الواقع نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے ہوتی تو قوموں کو اطمینان و سکون نصیب ہوتا۔ انفرادی یا اجتماعی ذہن کا تعلق طرزِ فکر سے ہے۔ طرزِ فکر میں اگر یہ بات ہے کہ ہماری کوشش اور اختراعات سے نوعِ انسانی کو اور اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچے تو یہ طرزِ فکر انبیا کی طرزِ فکر ہے اور یہی طرزِ فکر اللہ کی طرزِ فکر ہے۔ اور ان دونوں طرزوں کا اصطلاحی نام قلندر شعور ہے۔ قلندر شعور ہمیں بتاتا ہے کہ اگر انسان کے اندر استغنا ہے تو وہ نئی نئی بیماریوں، نئی نئی مصیبتوں اور نئی نئی پریشانیوں سے محفوظ رہتا ہے۔

استغنا حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انسان کی سوچ اور انسان کی طرزِ فکر اس طرزِ فکر سے ہم رشتہ ہو جو اللہ کی طرزِ فکر ہے۔ ہم جب زمین کے اوپر موجودات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ نے اپنی مخلوق کے لئے بے شمار وسائل پیدا کئے ہیں۔ لیکن ان وسائل میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا تعلق براہِ راست اللہ کی کسی ضرورت سے ہو۔ اللہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ باوجودیکہ اللہ ہر چیز سے بے نیاز ہے اور اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، وہ اپنی مخلوق کے لئے ایک قانون کے دائرے میں تسلسل کے ساتھ وسائل فراہم کرتا رہتا ہے۔ اگر کسی موسم میں آم کی ضرورت ہے تو ایک نظام کے تحت درخت پر پھول آئے گا، آم لگیں گے اور ان آموں سے لوگوں

کی ضروریات پوری ہوں گی۔ چوں کہ انسان وسائل کا محتاج ہے، اس لئے وہ اس طرح تو وسائل سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کہ وہ ہر طرف سے اپنا رشتہ منقطع کرے لیکن یہ طرزِ فکر اختیار کر سکتا ہے کہ یہ وسائل جو میری جدّوجہد سے ظہور میں آتے ہیں، پوری نوعِ انسانی کا حصہ ہیں۔ جس طرح میں ان سے فائدہ اٹھاتا ہوں اسی طرح نوعِ انسانی کو فائدہ اٹھانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ طرزِ فکر حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان جس طرزِ فکر کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس سے ذہنی قربت حاصل ہو۔ مثال کے طور پر اگر آپ کسی نیک آدمی سے دوستی کرنا چاہتے ہیں تو اس جیسے کام کرنے لگیں گے۔ کسی جوّاری کو اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں تو اس کے ساتھ جوّا کھیلنا شروع کر دیں گے۔ کسی اللہ والے سے دوستی کرنا چاہیں گے تو وہ تمام مشاغل اپنا لیں گے جو اللہ والوں کے لئے پسندیدہ ہیں۔ جس مناسبت سے ان مشاغل کو یا ان عادات کو اختیار کرتے چلے جائیں گے اسی مناسبت سے آپ کی طرزِ فکر بدلتی جائے گی۔

اللہ کی عادت

اللہ کی طرزِ فکر یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی خدمت کرتا ہے اور اس خدمت کا کوئی صلہ نہیں چاہتا۔ بندہ جب اختیاری طور پر اس طرزِ فکر کو اختیار کر لیتا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کی مخلوق کے کام آئے تو اُسے قلندر شعور منتقل ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ طرزِ فکر مستحکم ہو جاتی ہے تو اس کا ذہن ہر آن، ہر لمحہ اس طرف متوجہ رہتا ہے کہ میں وہ کام کر رہا ہوں جو اللہ کے لئے پسندیدہ ہے۔ بار بار اس عادت یا عمل کا اعادہ ہونے سے پہلے اس کے مشاہدات میں بے شمار ایسے واقعات آتے ہیں کہ

اس کے اندر یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ہو چکا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے، وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ اسی تعلق کو استغنا کا نام دیا جاتا ہے۔ پیغمبروں کی ساری زندگی اس عمل سے عبارت ہے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ تمام انبیائے کرام اور اولیاء اللہ کے اندر استغنا کی طرزِ فکر راسخ ہوتی ہے۔ انبیاء اس طرزِ فکر کو حاصل کرنے کا اہتمام اس طرح کیا کرتے تھے کہ وہ کسی چیز کے متعلق سوچتے تو اس چیز کے اور اپنے درمیان کوئی رشتہ براہِ راست قائم نہیں کرتے تھے۔ ان کی طرزِ فکر ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ کائنات کی تمام چیزوں کا اور ہمارا مالک اللہ ہے، کسی چیز کا رشتہ براہِ راست ہم سے نہیں ہے۔ بلکہ ہم سے ہر چیز کا رشتہ اللہ کی معرفت ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ طرزِ فکر مستحکم ہو جاتی اور ان کا ذہن ایسے رجحانات پیدا کر لیتا کہ جب وہ کسی چیز کی طرف مخاطب ہوتے تو اس چیز کی طرف خیال جانے سے پہلے اللہ کی طرف خیال جاتا۔ انہیں کسی چیز کی طرف توجہ دینے سے پیشتر یہ احساس عادتاً ہوتا کہ یہ چیز ہم سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اس چیز کا اور ہمارا واسطہ محض اللہ کی وجہ سے ہے۔

اس طرزِ عمل میں ذہن کی ہر حرکت کے ساتھ اللہ کا احساس قائم ہو جاتا ہے اللہ ہی بحیثیت محسوس کے ان کا مخاطب ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اللہ کی صفات ان کے ذہن میں ایک مستقل مقام حاصل کر لیتی ہیں اور ان کا ذہن اللہ کی صفات کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ یہ مقام حاصل ہونے کے بعد بندہ کے ذہن کی ہر حرکت اللہ کی صفات کی حرکت ہوتی ہے اور اللہ کی صفات کی کوئی حرکت قدرت اور حاکمیت کے وصف سے خالی نہیں ہے۔ اولیاء اللہ میں اہلِ نظامت (اہلِ

تکوین) کو اللہ کی طرف سے یہی ذہن عطا ہوا ہے اور رشد و ہدایت اور ترغیبی پروگرام (INSPIRATION) پر عمل کرنے والے اولیائے کرام اپنی ریاضت اور مجاہدوں کے ذریعے اسی ذہن کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عمل اور نیت

برائی یا بھلائی کا جہاں تک تعلق ہے، کوئی عمل دنیا میں برا ہے نہ اچھا ہے۔ دراصل کسی عمل میں معانی پہنانا، اچھائی یا برائی ہے۔ معانی پہنانے سے مراد نیت ہے۔ عمل کرنے سے پہلے انسان کی نیت میں جو کچھ ہوتا ہے، وہی خیر یا شر ہے۔

آگ کا کام جلانا ہے۔ ایک آدمی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے آگ کو کھانا پکانے میں استعمال کرتا ہے تو یہ عمل خیر ہے۔ وہی آدمی اس آگ سے لوگوں کے گھروں کو جلا ڈالتا ہے تو یہ برائی ہے۔

جن قوموں سے ہم مرعوب ہیں اور جن قوموں کے ہم دست نگر ہیں، ان کی طرزِ فکر کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سورج کی طرح روشن ہے کہ سائنس کی ساری ترقی کا زور اس بات پر ہے کہ ایک قوم اقتدار حاصل کرے۔ اور ساری نوعِ انسانی اس کی غلام بن جائے۔ یا ایجادات سے اتنے مالی فوائد حاصل کئے جائیں کہ زمین پر ایک مخصوص قوم یا مخصوص ملک مالدار ہو جائے۔ اور نوعِ انسانی غریب اور مفلوک الحال بن جائے۔ کیوں کہ اس ترقی میں اللہ کے ذہن کے مطابق نوعِ انسانی کی فلاح مضمر نہیں ہے، اس لئے یہ ساری ترقی نوعِ انسانی کے لئے اور خود ان قوموں کے لئے جنہوں نے جدّ و جہد اور کوشش کے بعد نئی نئی ایجادات کی ہیں مصیبت اور پریشانی بن گئی ہے۔ مصیبت اور یہ پریشانی ایک دور

ادبار بن کر زمین کو جہنم بنا دے گی۔

جب تک آدمی کے یقین میں یہ بات رہتی ہے کہ چیزوں کا موجود ہونا یا چیزوں کا عدم میں چلے جانا اللہ کی طرف سے ہے، اس وقت تک ذہن کی مرکزیت قائم رہتی ہے اور جب یہ یقین غیر مستحکم ہو کر ٹوٹ جاتا ہے تو آدمی ایسے عقیدے اور ایسے وسوسوں میں گرفتار ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ ذہنی انتشار ہوتا ہے، پریشانی ہوتی ہے، غم اور خوف ہوتا ہے۔ حالاں کہ اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ انسان کا ہر عمل، ہر فعل، ہر حرکت کسی ایسی ہستی کے تابع ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ ماں کے پیٹ میں بچے کا قیام، نو مہینے تک نشوونما کے لئے غذا کی فراہمی، پیدا ہونے سے پہلے ماں کے سینے میں دودھ، پیدائش کے بعد دودھ کی فراہمی، دودھ کی غذائیت سے ایک اعتدال اور توازن کے ساتھ بچے کا بڑھنا، چھوٹے سے بچے کا بڑھ کر سات فٹ کا ہو جانا، جوانی کے تقاضے، ان تقاضوں کی تکمیل میں وسائل کی تکمیل، وسائل فراہم ہونے سے پہلے وسائل کی موجودگی۔ اگر اللہ زمین کو منع کر دے کہ وہ کھیتیاں نہ اگائے تو حصولِ رزق مفقود ہو جائے گا۔ شادی کے بعد والدین کے دل میں یہ تقاضا کہ ہمارا کوئی نام لینے والا ہو اس درجے میں انتہائی درجے شدت اور اس کے نتیجے میں ماں باپ بننا، ماں باپ کے دل میں اولاد کی محبت پیدا ہونا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر اللہ والدین کے دل میں محبت نہ ڈالے تو اولاد کی پرورش کیسے ہو سکتی ہے۔ اولاد کی پرورش کے لئے ماں باپ کے دل میں، اولاد کی محبت صرف آدمیوں کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ جذبہ اللہ کی ہر مخلوق میں مشترک ہے اور اسی محبت کے سہارے ماں باپ اپنی اولاد کی پرورش

کرتے ہیں، نگہداشت کرتے ہیں اور ان کے لئے وسائل فراہم کرتے ہیں۔

زمین کے اندر بیج کی نشوونما

عام طور سے یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ محنت اور جدوجہد کے بغیر وسائل کا حصول ناممکن ہے جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جن وسائل کے حصول میں ہم جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں وہ ایک قاعدے اور قانون کے تحت پہلے سے موجود ہیں۔ کسان جب محنت کر کے زمین میں بیج ڈالتا ہے اور اس بیج کی نشوونما سے انسانی ضروریات کے لئے قسم قسم کی غذائیں فراہم ہوتی ہیں۔ یہ سب اس وقت ممکن ہوتا ہے جب پہلے سے وسائل موجود ہوں۔ مثلاً بیج کا موجود ہونا، زمین کا موجود ہونا، زمین کے اندر بیج کو نشوونما دینے کی صلاحیت کا ہونا، بیج کی نشوونما کے لئے پانی کا موجود ہونا، چاندنی کا موجود ہونا، ہوا کا موجود ہونا اور موسم کے لحاظ سے سرد گرم فضا کا موجود ہونا۔ اگر بیج موجود نہ ہو یا زمین کے اندر بیج کو نشوونما دینے کی صلاحیت موجود نہ ہو، پانی موجود نہ ہو، ہوا موجود نہ ہو تو انسان کی ہر کوشش بیکار ہو جائے گی۔

اللہ کی ذیلی تخلیق

اللہ کا یہ وصف ہے کہ جب وہ کسی چیز کو تخلیق کرتا ہے تو اس تخلیق سے اربوں، کھربوں تخلیقات وجود میں آتی ہیں۔ موجودہ دور میں بجلی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اللہ کی ایک ذیلی تخلیق بجلی (ELECTRICITY) ہے۔ اس بجلی کے ذریعے ہزاروں ایجادات منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اور آئندہ آتی رہیں گی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہمارے اوپر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ اللہ نے وسائل اس لئے تخلیق کئے ہیں کہ نوعِ انسانی ان

وسائل کے اندر مخفی قوتوں کو تلاش کر کے ان سے کام لے۔ اور جب قوم ان مخفی صلاحیتوں کی تلاش میں لگ جاتی ہے تو اس کے اوپر اللہ کی طرف سے نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ اور جب وہ انکشافات کی روشنی میں تفکر کرتی ہے تو نئی نئی ایجادات وجود میں آتی رہتی ہیں۔ قلندر شعور ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں سب دو رخوں پر قائم ہیں۔ تخلیق کا ایک رخ ظاہر ہے اور دوسرا رُخ باطن ہے۔ پانی ایک سیال چیز ہے۔ یہ اس کا ظاہری رُخ ہے۔ لیکن جب پانی کے اندر مخفی صلاحیتوں کو تلاش کیا جاتا ہے تو اس کی بے شمار صلاحیتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اسی طرح لوہے کی مثال ہے۔ لوہا بظاہر ایک دھات ہے۔ لوہے کے ذرات کے اندر جب کوئی شخص محض قوتوں کو تلاش کر لیتا ہے تو نئی نئی اختراعات اور ایجادات اس کے ارادے اور اختیار سے بنتی رہتی ہیں۔

جب ہم کسی چیز کے اندر اللہ کی صفات تلاش کرتے ہیں تو ہمارے اوپر یہ منکشف ہوتا ہے کہ پوری کائنات موجود ہے۔ کائنات میں جو کچھ بنایا گیا ہے، یا زمین میں جو کچھ موجود ہے، سب انسان کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔

صحیح تعریف

استغنا سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی روپے پیسے کی طرف سے بے نیاز ہو جائے۔ چوں کہ روپے پیسے اور خواہشات سے کوئی بندہ بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ضروریاتِ زندگی اور متعلقین کی کفالت ایک لازمی امر ہے اور اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ استغنا سے مراد یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کرے، اس عمل میں اس کے ساتھ اللہ کی خوشنودی ہو۔ اور اس طرزِ فکر یا عمل سے اللہ کی مخلوق کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے۔ ہر بندہ خود

خوش رہے اور نوعِ انسانی کے لئے مصیبت اور آزار کا سبب نہ بنے۔ ضروری ہے کہ بندہ کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو کہ کائنات میں موجود ہر شے کا مالک در دبست اللہ ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے زمین بنائی، اللہ ہی ہے جس نے بیج بنایا، اللہ ہی ہے جس نے زمین کو اور بیج کو یہ وصف بخشا ہے کہ بیج درخت میں تبدیل ہو جائے اور زمین اس کو اپنی آغوش میں پروان چڑھائے۔ پانی درختوں کی رگوں میں خون کی طرح دوڑے۔ ہوا روشنی بن کر درخت کے اندر کام کرنے والے رنگوں کی کمی کو پورا کرے۔ دھوپ درخت کے ناپختہ پھلوں کو پکانے کے لئے مسلسل ربط اور قاعدے کے ساتھ درخت سے ہم رشتہ رہے چاندنی پھلوں میں مٹھاس پیدا کرے۔ زمین کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ ایسے درخت اگائے جو انسان کی ضروریات کو پورا کرے۔ درختوں کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ ایسے پتے اور پھل پیدا کریں کہ جن سے مخلوق کی ضروریات موسم کے لحاظ سے پوری ہوتی رہیں۔

کائنات کی رکنیت

اللہ یہ چاہتا ہے کہ کائنات کے اندر موجود ہر شے مسلسل حرکت میں رہے۔ جو بندے اللہ کے اس فرمان، اس خواہش اور اس وصف کو قبول کر کے جدوجہد کرتے ہیں، وہ کائنات کے رکن بن جاتے ہیں اور یہ رکنیت کائنات کو متحرک اور فعال رکھتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ نوعِ انسانی کے افراد کو پیدائش کے وقت ذہنی طور پر پس ماندہ، پاگل یا مخبوط الحواس کر دے تو انسان کیا کر سکتا ہے اور اس سے کون سی ترقی ممکن ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ ایسے بچے بھی پیدا ہوتے ہیں جو ترقی اور تنزلی سے واقف ہی نہیں ہوتے۔

ابھی ہم نے بتایا ہے کہ وہ لوگ جن کے اندر اللہ کی ذات کے ساتھ وابستگی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کے ہر عمل پر اللہ محیط ہے۔ جب کسی بندے کے اندر یہ طرزِ فکر پوری طرح قائم ہو جاتی ہے تو روحانیت میں ایسے بندے کا نام مستغنی ہے۔ جب کوئی بندہ مستغنی ہو جاتا ہے تو اس کے اندر ایسی طرزِ فکر قائم ہو جاتی ہے کہ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ میرا تعلق ایک ہستی کے ساتھ قائم ہے جو میری زندگی پر محیط ہے۔ بار بار جب یہ احساس ابھرتا ہے تو یہ احساس ایک مظاہراتی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ یہ دیکھنے لگتا ہے کہ روشنی کا ایک دائرہ ہے اور میں اس دائرے میں موجود ہوں۔ یہ دائرہ ایک روشنی ہے اور اس روشنی میں بشمولِ انسان ساری کائنات بند ہے۔ اس بات کو تمام آسمانی کتابوں نے بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ آسمانی کتابیں بتاتی ہیں کہ آسمان اور زمین جس بساط پر قائم ہے، وہ ایک روشنی ہے۔ جو ہر لمحہ، ہر آن کائنات کی ہر چیز کو اللہ کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے۔ مستغنی آدمی کی نظر جب اس دائرے یا روشنی کے بارے پر ٹھہرتی ہے تو اس کی نظروں کے سامنے وہ فارمولے آجاتے ہیں جن فارمولوں سے تخلیق عمل میں آتی ہے۔

جنّت دوزخ

جنت میں وہ لوگ رہیں گے جنہوں نے آسمانی کتابوں کی تعلیمات کو اس طرح سمجھا جس طرح پیغمبروں نے سمجھا ہے۔ جنت کے باسی وہ لوگ ہوں گے جن کے سروں پر اللہ نے اپنا دستِ شفقت رکھ دیا ہے۔ جن لوگوں کے اوپر اللہ نے اپنا دستِ شفقت رکھ دیا ہے، وہ اللہ کے دوست ہیں۔ چوں کہ اللہ خوف، غم، پریشانی سے

بے نیاز ہے، اس لئے اللہ کے دوست میں اللہ کی صفت کا عکس نمایاں ہو جاتا ہے اور اسے نہ خوف ہوتا ہے، نہ غم ہوتا ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے دوست نہیں ہیں، جنت کی فضا انہیں کبھی قبول نہیں کرے گی۔ وہ دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔ اگر کسی کے اندر خوف اور غم ہے تو وہ اللہ کے بیان کردہ قانون کے مطابق اللہ کا دوست نہیں ہے۔ اور جو بندہ اللہ کا دوست نہیں ہے، جنت اسے رد کر دیتی ہے۔

توکّل اور بھروسہ

عام حالات میں جب استغنا کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے اوپر کتنا توکل اور بھروسہ ہے۔ توکل اور بھروسہ کم و بیش ہر آدمی کی زندگی میں دخل ہے۔ لیکن جب ہم توکل اور بھروسے کی تعریف کرتے ہیں تو ہمیں بجز اس کے کچھ نظر نہیں آتا کہ ہماری دوسری عبادات کی طرح توکل اور بھروسہ بھی لفظوں کا ایک خوش نما جال ہے۔ توکل اور بھروسے سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دے! لیکن جب ہم فی العمل زندگی کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ بات محض لفظی اور غیر یقینی نظر آتی ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے کہ ہر آدمی کی زندگی میں اس کا عمل دخل ہے۔ ہر آدمی کچھ اس طرح سوچتا ہے کہ ادارے کا مالک یا سیٹھ اگر مجھ سے ناراض ہو گیا تو ملازمت سے برخاست کر دیا جاؤں گا۔ یا میری ترقی نہیں ہو گی یا ترقی تنزلی میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ جب کسی کام کا نتیجہ اچھا مرتب ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ نتیجہ ہماری عقل، ہماری ہمت اور ہماری فہم و فراست سے

مرتب ہوا ہے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بندے کا اللہ کے اوپر توکل اور بھروسہ محض مفروضہ ہے۔ جس بندے کے اندر توکل اور بھروسہ نہیں ہوتا، اس کے اندر استغنا بھی نہیں ہوتا۔ توکل اور بھروسہ دراصل ایک خاص تعلق ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان قائم ہے۔ اور جس بندے کا اللہ کے ساتھ یہ تعلق قائم ہو جاتا ہے، اس کے اندر سے دنیا کا لالچ نکل جاتا ہے۔ ایسا بندہ دوسرے تمام بندوں کی مدد و استعانت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ اللہ کی صفات یہ ہیں کہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، اللہ اپنی مخلوق سے کسی قسم کی احتیاج نہیں رکھتا۔ اللہ نہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ کسی کا باپ ہے۔ اللہ کا کوئی خاندان بھی نہیں ہے۔ ان صفات کی روشنی میں جب ہم مخلوق کا تجزیہ کرتے ہیں تو جان لیتے ہیں کہ مخلوق ایک نہیں ہے۔ مخلوق ہمیشہ کثرت سے ہوتی ہے۔ مخلوق زندگی کے اعمال و حرکات پورے کرنے پر کسی نہ کسی احتیاج کی پابند ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مخلوق کسی کی اولاد ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ مخلوق کی کوئی اولاد ہو اور مخلوق کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا کوئی خاندان ہو۔ اللہ کی بیان کردہ ان پانچ ایجنسیوں میں جب "قلندر شعور" تفکر سے کام لیا جاتا ہے تو یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ اللہ کی بیان کردہ پانچ صفات میں سے مخلوق ایک صفت میں اللہ کی ذات سے براہ راست تعلق قائم کر سکتی ہے۔ مخلوق کے لئے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ کثرت سے بے نیاز ہو جائے۔ مخلوق اس بات پر بھی مجبور ہے کہ اس کی اولاد ہو یا وہ کسی کی اولاد ہو۔ مخلوق کا خاندان ہونا بھی ضروری ہے۔

اللہ کی پانچ صفات میں سے چار صفات میں مخلوق اپنا اختیار استعمال نہیں کر سکتی۔ صرف ایک حیثیت میں مخلوق اللہ کی صفت سے ہم رشتہ ہو سکتی ہے۔ وہ صفت یہ ہے کہ تمام وسائل سے ذہن ہٹا کر اپنی ضروریات اور احتیاج کو اللہ کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے۔ بندے کے اندر اگر مخلوق کے ساتھ احتیاجی عوامل کام کر رہے ہیں تو وہ توکل اور بھروسہ کے اعمال سے دُور ہے۔ روحانیت کے راستے پر چلنے والے مسافر کو اس بات کی مشق کرائی جاتی ہے کہ زندگی کے تمام تقاضے اور زندگی کی تمام حرکات و سکنات جب شاگرد دروبست پیر و مرشد کے سپرد کر دیتا ہے تو وہ اس کی تمام ضروریات کا کفیل بن جاتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ایک دُودھ پیتے بچے کے کفیل اس کے ماں باپ ہوتے ہیں جب تک بچہ شعور کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا، ماں باپ چوبیس گھنٹے اس کی فکر میں مُبتلا رہتے ہیں۔ گھر کا دروازہ نہ کھلے کہ بچہ باہر نکل جائے گا۔ سردی ہے تو بچے نے کپڑے کیوں اتار دیئے، سردی لگ جائے گی۔ کھانا وقت پر نہیں کھایا تو ماں باپ پریشان ہیں کہ بچے نے وقت پر کھانا کیوں نہیں کھایا۔ بچہ ضرورت سے زیادہ سو گیا تو اس بات کی فکر کہ کیوں زیادہ سو گیا۔ نیند کم آئی تو یہ پریشانی ہے کہ بچہ کم کیوں سویا۔ ہر شخص جو پیدا ہوا ہے اور جس کی اَولاد ہے اور جس نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ بچے کی تمام بنیادی ضروریات کے کفیل اس کے ماں باپ ہوتے ہیں اور یہ کفالت اس طرح پوری کی جاتی ہے کہ جس کا تعلق بچے کے اپنے ذہن سے قطعاً نہیں ہوتا۔ چوں کہ شاگرد، مرید یا چیلہ پیر و مرشد (مراد یا شیخ) کی روحانی اولاد ہوتا ہے، اس لئے وہ مرید کی دینی، دنیاوی، روحانی

ہر طرح کی کفالت کرتا ہے۔ اور جیسے جیسے کفالت بڑھتی ہے، پیر و مرشد کا ذہن مرید کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ جب شیخ مُرید کی کفالت کرتا ہے تو مُرید کا لاشعور یہ بات جان لیتا ہے کہ جو بندہ میری کفالت کر رہا ہے، اس کا کفیل اللہ ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کا ذہن آزاد ہو جاتا ہے اور اس کی تمام ضروریات اور تمام احتیاج اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہو جاتی ہیں۔

قلندر شعور اسکول

قلندر شعور اسکول میں داخل ہونے سے پہلے میرے اندر دو برائیاں بہت زیادہ تھیں۔ اوّل یہ کہ میرا ذہن کاروباری تھا۔ جب بھی میں کسی آدمی سے ملتا تھا، اس کی ذات سے کوئی نہ کوئی توقع قائم کر لیتا تھا۔ قلندر بابا اولیاءؒ کی غلامی میں آنے کے بعد سب سے پہلے اس طرزِ فکر پر ضرب پڑی۔ جس آدمی سے جو توقع وابستہ کی وہ پوری نہیں ہوئی۔ یہ عمل اتنی بار دہرایا گیا کہ دوستوں کی طرف سے مایوسی طاری ہو گئی اور ذہن میں بالآخر یہ بات آئی کہ کوئی دوست اسی وقت کام آسکتا ہے جب اللہ چاہے۔

سونا کھاؤ!

اس کے بعد دوسرا تربیتی پروگرام شروع ہوا۔ رُوحانی آنکھ سے دیکھا کہ ایک بہت بڑا کمرہ ہے۔ اس میں بہت ساری الماریاں ہیں۔ ان الماریوں میں سونے کی اینٹیں رکھی ہوئی ہیں۔ اڑتالیس گھنٹے یہ کیفیت قائم رہی کہ میں ایک کمرے میں بند ہوں اور کمرہ سونے کی اینٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کیفیت کے ساتھ ساتھ ذہن روٹی کھانے کی طرف مائل ہوتا تو میرے کانوں میں ایک ماورائی آواز گونجتی کہ "سونا کھاؤ"۔ پانی پینے کی

خواہش ہوتی، پانی تو وہاں کہاں تھا۔ آواز آتی "سونے چاندی سے پیاس بجھاؤ"۔ اور جب میں اس کیفیت سے باہر آیا تو دس روپے کے نوٹ سے بھی طبیعت میں گندگی کا احساس ہوتا تھا اور اس کے بعد اللہ کی طرف سے مسلسل ایسے ہزاروں واقعات رونما ہوئے کہ جن کا وجود میں آنا عقلاً ناممکن اور مشکل تھا۔ ایک دفعہ، دس دفعہ، بیس دفعہ، سو دفعہ جب اس طرح کے تجربات ہوتے رہے تو ذہن میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ جو اللہ چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ رُوحانیت کوئی ایسا علم نہیں ہے جو صرف لفظوں پر قائم ہے۔ روحانیت عملی اور مشاہداتی علم ہے۔

آٹومیٹک مشین

پیدائش سے موت تک اور موت کے بعد کی زندگی میں اعراف، حشر و نشر، حساب کتاب، جنت دوزخ اور اللہ کی تجلّی کا دیدار سب کا سب یقین کے اوپر قائم ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ آدمی کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے، وہ موجود ہے۔ اس کے اندر عقل و شعور کام کرتا ہے، وہ ایک حد تک با اختیار ہے اور بڑی حد میں اس کے اوپر غیر اختیاری کیفیات نازل ہوتی رہتی ہیں مثلاً کوئی آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے اگر سانس لینا شروع کر دے تو وہ چند منٹ میں ہانپ جائے گا۔ روٹین (ROU-TINE) کی زندگی میں بھوک لگتی ہے، وہ کچھ کھا لیتا ہے۔ پیاس لگتی ہے، پانی پی لیتا ہے۔ یہی حال آدمی کے اندر اس مشین کا ہے جو مسلسل متواتر، ہر لمحہ اور ہر آن چل رہی ہے۔ اس مشین کے کل پُرزے ذہن، اعضائے رئیسہ دل، پھیپھڑے، گردے، جگر اور آنتوں کی حرکت مسلسل جاری ہے۔ چار ارب کی آبادی میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اندر نصب کی ہوئی مشین کو چلاتا ہو

مشین بالکل غیر اختیاری طور پر چل رہی ہے۔ اس مشین میں جو ایندھن استعمال ہوتا ہے، اس پر بھی انسان کی دسترس نہیں ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب مشین بند ہو جاتی ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت، علم کی بڑی سے بڑی ترقی اسے چلا نہیں سکتی۔ یہ مشین قدرتی نظام کے تحت بتدریج بھی بند ہوتی ہے اور اک دم بھی بند ہو جاتی ہے۔ بتدریج بند ہونے کا نام "بیماری" اور مشین کے ایک دم بند ہونے کو "ہارٹ فیلیئر" (HEART FAILURE) کہا جاتا ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ بیماریوں کا علاج اختیاری ہے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ چار ارب کی آبادی میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو بیمار ہونا یا مرنا چاہتا ہے۔ اگر زندہ رہنا اختیاری ہوتا تو دنیا میں کوئی آدمی موت سے ہم آغوش نہ ہوتا۔ علیٰ ہٰذالقیاس زندگی کے بنیادی عوامل اور وہ تمام حرکات جن پر زندگی رواں دواں ہے، انسان کے لئے اختیاری نہیں ہے۔ اگر ہم بنیاد پر غور کریں تو زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب آدمی پیدا ہوتا ہے جبکہ پیدائش پر انسان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ لاکھوں سال کے طویل عرصے میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا ہو گیا ہو۔ پیدا ہونے والی ہر چیز، پیدا ہونے والا ہر فرد ایک وقت معینہ کے لئے اس دنیا میں آتا ہے اور جب وہ وقت پورا ہو جاتا ہے تو آدمی ایک سیکنڈ کے لئے بھی اس دنیا میں ٹھہر نہیں سکتا، مر جاتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس میں زیادہ سوچ بچار اور تفکر کی ضرورت پیش آئے۔ ہر لمحہ، ہر آن، ہر منٹ، ہر سیکنڈ یہ صورتِ حال واقع ہو رہی ہے۔ مختصر یہ کہ اللہ اپنی مرضی سے پیدا کرتا ہے اور مختلف صورتوں میں پیدا کرتا ہے۔ قد کاٹھ مختلف ہوتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا گیا ہے کہ کوئی بنیادی طور پر کوتاہ قد آدمی سات فٹ کا بن گیا ہو۔ ایسی

بھی دنیا میں کوئی مثال نظر نہیں آتی کہ سات فٹ کا آدمی گھٹ کر ڈھائی فٹ کا ہو گیا ہو۔

انسان، وقت اور کھلونا

جب ہم عقل و شعور کا موازنہ کرتے ہیں تو کوئی آدمی ہمیں زیادہ باصلاحیت نظر آتا ہے کوئی آدمی کم صلاحیت اور کوئی آدمی بالکل بے عقل ہوتا ہے۔ سائنس خلا (SPACE) میں چہل قدمی کا دعویٰ کر سکتی ہے لیکن ایسی کوئی مثال سامنے نہیں آتی کہ بے عقل آدمی کو عقل مند بنا دیا گیا ہو۔

اللہ ہی اپنی مرضی سے عقل و شعور بخشتا ہے۔ آدمی کے اندر فکر و گہرائی عطا کرتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر اللہ فکر اور گہرائی عطا کرتا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا ذاتی وصف ہے لیکن جب وہ فکر اور گہرائی ان سے چھین لی جاتی ہے تو اس وقت وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

زندگی کے تمام اجزائے ترکیبی ایک طاقت کے پابند ہیں۔ وہ طاقت جس طرح چاہے روک دیتی ہے اور جس طرح چاہے انہیں چلاتی ہے۔ قلندر شعور کے بانی قلندر بابا اولیاءؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ لوگ نادان ہیں، کہتے ہیں کہ ہماری گرفت حالات کے اوپر ہے۔ انسان اپنی مرضی اور منشا کے مطابق حالات میں ردّ و بدل کر سکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ انسان ایک کھلونا ہے۔ حالات جس قسم کی چابی اس کے اندر بھر دیتے ہیں اسی طرح یہ کودنا، ناچنا شروع کر دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر فی الواقع حالات کے اوپر انسان کو دسترس حاصل ہوتی تو کوئی آدمی غریب نہ ہوتا، کوئی آدمی بیمار نہ پڑتا، کوئی آدمی بوڑھا نہ ہوتا اور کوئی موت کے منہ میں نہ جاتا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بڑے۔ بڑے لوگ جنہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا، موت کے پنجے نے ان کی گردن مروڑ کر رکھ دی۔ شداد، نمرود اور فرعون کی مثالیں ایسی نہیں ہیں کہ جن کو ہم محض کہانی کہہ کر گزر جائیں۔ تاریخ ہر زمانے میں خود کو دہراتی ہے۔ البتہ رنگ رُوپ، نام، شکل وصورت بدل جاتے ہیں۔ اس زمانے میں شہنشاہِ ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے جس نے ڈھائی ہزار سال کی سالگرہ منائی۔ موت کے پنجے نے اس کو اس قدر بے بس اور ذلیل کر دیا کہ اس کے لئے اس کی سلطنت کی زمین بھی تنگ ہو گئی۔ اور وہ دیارِ غیر میں مر گیا۔ کوئی اس کا پُرسانِ حال نہیں ہوا۔ اگر حالات انسان کی گرفت میں ہیں تو اتنا بڑا بادشاہ غریبُ الدیار کیسے بن گیا۔ اس قسم کے بے شمار واقعات ہر روز پیش آتے رہتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم ان باتوں پر غور نہیں کرتے اور ان سب باتوں کو اتفاق کہہ کر گزر جاتے ہیں جب کہ کائنات میں اتفاق یا حادثہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اللہ کا ایک نظام ہے جو مربوط ہے۔ ہر نظام کی دوسرے نظام کے ساتھ وابستگی ہے۔ اس نظام میں نہ کہیں اتفاق ہے، نہ کہیں حادثہ ہے، نہ کوئی مجبوری ہے۔

جب کسی بندے کے اندر یہ بات یقین بن جاتی ہے کہ اس نظام میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی حرکت اور بڑی سے بڑی شے اللہ کے بنائے ہوئے نظام کے تحت قائم ہے تو اس کے اندر یقین کا ایک پیٹرن بن جاتا ہے۔ اس پیٹرن کو جب تحریکات ملتی ہیں اور زندگی میں مختلف واقعات پیش آتے ہیں تو ان واقعات کی کڑیاں اس قدر مضبوط، مستحکم اور مربوط ہوتی ہیں کہ آدمی یہ سوچنے اور ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کائنات پر حاکمِ اعلیٰ اللہ ہے۔

آسمان سے نوٹ گرا

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کسی چیز کے اوپر یقین کا کامل ہو جانا اس وقت ممکن ہے جب وہ چیز یا عمل جس کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ یہ کس طرح واقع ہو گی، بغیر کسی ارادے، اختیار اور وسائل کے پوری ہوتی رہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں کمرے میں بیٹھا ہوا قلندر بابا اولیاءؒ کی تصنیف "لوح وقلم" کے صفحات کو دوبارہ لکھ رہا تھا۔ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ لاہور سے کچھ مہمان آ گئے۔ عام حالات میں چونکہ تھوڑی دیر کے بعد کھانے کا وقت تھا، اس لئے ذہن میں یہ بات آئی کہ ان مہمانوں کو کھانا کھلانا چاہئے۔ یہ اس دَور کا واقعہ ہے جب میں "حیرت" کے مقام میں تھا۔ اور نہ صرف یہ کہ کھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا، لباس بھی مختصر ہو کر ایک لُنگی اور ایک بنیان رہ گیا تھا۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ اس لباس میں گرمی، سردی اور برسات کس طرح گزری جب اللہ چاہتا ہے تو ہمت اور توفیق عطا کر دیتا ہے اور بڑی سے بڑی مشکلات اور پریشانیاں پلک جھپکتے گزر جاتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ پڑوس میں سے پانچ رُوپے اُدھار مانگ لئے جائیں۔ اور ان روپوں سے خورد و نوش کا انتظام کیا جائے۔ پھر خیال آیا کہ پڑوسی نے اگر پانچ روپے دینے سے انکار کر دیا تو بڑی شرمندگی ہو گی۔ پھر خیال آیا کہ جھونپڑی والے ہوٹل سے کھانا اُدھار لے لیا جائے۔ طبیعت نے اس کو بھی پسند نہیں کیا۔ یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اللہ چاہے گا تو کھانے کا انتظام ہو جائے گا۔ میں کمرے سے باہر آیا۔ جیسے ہی دروازے سے قدم باہر نکالا، چھت سے پانچ روپے کا ایک نوٹ گرا۔ نوٹ نیا اور صاف شفاف تھا کہ زمین پر گرنے کی آواز آئی۔

فرش پر جب نیا نوٹ پڑا ہوا دیکھا تو میرے اوپر دہشت طاری ہو گئی۔ لیکن یکایک ذہن میں ایک آواز گونجی یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ میں نے وہ نوٹ اٹھا لیا اور کھانے پینے کا بافراغت انتظام ہو گیا۔

ساٹھ روپے ٦٠

عید کا چاند دیکھنے کے بعد بچوں کی عیدی کے سلسلے میں فکر لاحق ہوئی اور میں اپنے ایک دوست کے پاس کچھ روپے اُدھار لینے چلا گیا۔ دوست نے مجھ سے کہا کہ روپے تو میرے پاس موجود ہیں لیکن کسی کی امانت ہیں۔ طبیعت نے اس بات کو گوارہ نہ کیا کہ دوست کو امانت میں خیانت کرنے کا جُرم قرار دیا جائے۔ وہاں سے چلتا ہوا بازار میں آگیا۔ وہاں مجھے ایک دوست ملے، بہت اچھی طرح پیش آئے اور انہوں نے پیش کش کی کہ آپ کو عید کے لئے کچھ روپے پیسے کی ضرورت ہو تو بلا تکلف لے لیں۔ لیکن میں نے ان کی اس پیش کش کو نامنظور کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ "صاحب! میں نے آپ سے کسی زمانے میں کچھ روپے اُدھار لئے تھے، وہ میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔" اور انہوں نے میری جیب میں ساٹھ روپے ڈال دیے۔ میں گھر چلا آیا اور ان ساٹھ روپوں سے عید کی تمام ضروریات پوری ہو گئیں۔

اس واقعے کے اندر بہت زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ دوست سے میں تیس ٣٠ روپے اُدھار لینے گیا تھا اور اللہ نے مجھے اتنے پیسے دلوا دیے جو میری ضرورت کے لئے کافی تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر تیس روپے بطور قرض مل جاتے تو ضرورت پوری نہ ہوتی۔ میں نے صرف یہ دو واقعات گوش گزار کئے ہیں۔ اس قسم کے بے شمار واقعات میری زندگی میں پیش آتے رہے۔

گاؤں میں مُرغ پلاؤ

استغنا کے ضمن میں غوث علی شاہ قلندرؒ پانی پتی اپنی تصنیف "تذکرہ غوثیہ" میں ایک دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں کہ —

میں ایک دیہات کی مسجد میں امام تھا۔ مسجد میں ایک فقیر آکر رُک گیا۔ مغرب کے بعد میں نے اُسے کھانے کے لئے بلایا تو اس فقیر نے پوچھا کھانے میں کیا ہے؟ اتفاق سے اس روز دال روٹی تھی۔ فقیر نے یہ بات سن کر کہ دال روٹی ہے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اور خاموش ہو گیا۔ میں نے دوبارہ کھانے کے لئے اصرار کیا تو بولا کہ میرا اللہ سے یہ معاہدہ ہے کہ اگر وہ مجھے مُرغ پلاؤ دیتا ہے تو کھاتا ہوں ورنہ نہیں کھاتا۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ نفسیاتی مریض ہے اس کے لئے کھانا بچا کر رکھ دیا۔ برسات کا موسم تھا۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ میں اپنے حجرے میں چلا گیا۔ اور دروازہ بند کر کے سونے کے لئے لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اور اس موسلا دھار بارش میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اٹھ کر میں نے دروازہ کھولا تو ایک صاحب سر پر بوری اوڑھے دروازے کے باہر کھڑے تھے اور ان صاحب نے ایک تھال مجھے پکڑا دیا۔ اور کہا "ملاجی! ہم نے منت مانی تھی۔ یہ مُرغ پلاؤ ہے۔ برتن صبح آجائیں گے۔" میں یہ مرغ پلاؤ لے کر فقیر کے پاس گیا اور تھال اسے پکڑا دیا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

مچھلی مل جائے گی؟

ایک رات کا ذکر ہے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے رات کا وقت تھا۔ قلندر بابا اولیاءؒ نے ارشاد فرمایا "مچھلی مل جائے گی؟" میں نے عرض کیا حضور! ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ میں کوشش

کرتا ہوں۔ کسی ہوٹل میں ضرور مل جائے گی۔ قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا۔ "ہوٹل کی پکی ہوئی مچھلی میں نہیں کھاتا۔" میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ اس وقت کچی مچھلی کہاں سے ملے گی۔ اس زمانے میں ناظم آباد کی آبادی بہت ہی کم تھی۔ بہر حال، میں نے اپنے دل میں یہ سوچ لیا کہ مچھلی ضرور تلاش کرنی چاہیئے۔ یہ سوچ کر میں نے ٹوکری اٹھائی تو قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا کہ اب رہنے دو، صبح دیکھا جائے گا۔ ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ باہر جا کر دیکھا تو ایک صاحب ہاتھ میں ایک مچھلی لئے کھڑے ہیں۔ انہوں نے کہا: "میں ٹھٹھہ سے آرہا ہوں اور یہ مچھلی قلندر باباؒ کی نذر ہے۔" یہ کہتے ہی وہ صاحب رخصت ہو گئے۔

پرندوں کا رزق

بے شمار واقعات پیش آنے کے نتیجے میں یہ یقین مستحکم اور پختہ ہو گیا کہ ضروریات کا واحد کفیل اللہ ہے۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ میں رازق ہوں۔ وہ بہر حال ہمیں رزق پہنچاتا ہے اور اللہ کے وہ کارندے جو تکوین کے شعبے سے وابستہ ہیں اور جن کے بارے میں اللہ نے فی الارض خلیفہ کہا ہے اس بات پر کاربند ہیں کہ وہ مخلوق کو زندہ رکھنے کے لئے وسائل فراہم کریں۔ بہت عجیب بات یہ ہے کہ اللہ اپنی مرضی سے پیدا کرتا ہے، جب تک وہ چاہتا ہے آدمی زندہ رہتا ہے اور جب وہ نہیں چاہتا تو آدمی ایک سیکنڈ کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن آدمی یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اپنے اختیار سے زندہ ہوں۔ معاشی سلسلہ میرے اختیار سے قائم ہے۔

کسان جب کھیتی کاٹتا ہے تو جھاڑو سے ایک ایک دانہ سمیٹ لیتا ہے اور جو دانے خراب ہوتے ہیں یا گھن کھائے ہوئے ہوتے ہیں ان کو بھی اکٹھا کر کے جانوروں

کے آگے ڈال دیتا ہے۔ جس زمین پر گندم بالوں سے علیحدہ کر کے صاف کیا جاتا ہے، وہاں اگر آپ تلاش کریں تو مشکل سے چند دانے نظر آئیں گے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق پرندے اربوں کھربوں کی تعداد میں دانہ چگتے ہیں تو یہ معمہ حل نہیں ہوتا کہ کسان تو ایک دانہ نہیں چھوڑتا، ان پرندوں کے لئے کوئی مخصوص کاشت نہیں ہوتی تو پھر یہ پرندے کہاں سے کھاتے ہیں؟

قانون یہ ہے کہ پرندوں کا غول جب زمین پر اس ارادے سے اترتا ہے کہ ہمیں دانہ چگنا ہے تو اس سے پہلے کہ ان کے پنجے زمین پر لگیں، قدرت وہاں دانہ پیدا کر دیتی ہے۔ اگر پرندوں کی غذا کا دارومدار کسان پر ہوتا تو سارے پرندے بھوک سے مر جاتے۔

درخت اور گھاس

چوپائے بہر حال انسانوں سے بہت بڑی تعداد میں زمین پر موجود ہیں۔ بظاہر وہ زمین پر اُگی ہوئی گھاس کھاتے ہیں، درختوں کے پتے چرتے ہیں لیکن جس مقدار میں گھاس اور درختوں کے پتے کھاتے ہیں، زمین پر کوئی درخت نہیں رہنا چاہیئے۔ قدرت ان کی غذائی کفالت پوری کرنے کے لئے اتنی بڑی مقدار میں درخت اور گھاس پیدا کرتی ہے کہ گھاس اور پتوں میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ ان درختوں اور گھاس کا تذکرہ ہے جس میں انسان کا کوئی تصرف نہیں ہے۔ قدرت اپنی مرضی سے انہیں پیدا کرتی ہے اور اپنی مرضی سے سرسبز و شاداب رکھتی ہے۔

زندگی کی بنیادی ضروریات اللہ بغیر کسی جدوجہد اور محنت کے تقسیم کرتا ہے۔ بنیادی ضروریات میں سب سے اہم ہوا، پانی، دھوپ، چاند کی روشنی شامل ہیں۔ اگر

انسان اپنی ضروریات کا خود کفیل ہے تو اس کے پاس ایسی کون سی طاقت ہے، ایسا کون سا علم ہے کہ وہ دھوپ حاصل کر سکے۔ زمین کے اندر اگر پانی کے سوتے خشک ہو جائیں تو انسان کے پاس ایسا کون سا علم یا طاقت ہے کہ وہ زمین کے اندر پانی کی نہریں جاری کر دے۔ یہی حال ہوا کا ہے۔ ہوا اگر بند ہو جائے، اللہ کا وہ نظام جو ہوا کو تخلیق کرتا ہے اور ہوا کو گردش میں رکھتا ہے، اگر معطل ہو جائے تو زمین پر موجود اربوں کھربوں مخلوق ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اللہ کی رزاقیت اور وسائل کی تقسیم کے سلسلے میں قلندر غوث علی شاہ سے ایک واقعہ سنئے۔

مزدور برادری

ایک شہر میں کساد بازاری اس حد تک پہنچ گئی کہ وہاں کے بازار ویران ہو گئے۔ جب کاروبار چلنے کی صورت سامنے نہ آئی تو لوگوں نے اس شہر سے نقل مکانی کرنا شروع کر دیا۔ اس کساد بازاری اور نقل مکانی کی وجہ سے شہر میں رہنے والے غریب مزدور نہایت پریشان اور بدحال ہونے لگے۔ ابھی اس مصیبت کا کوئی حل سامنے نہیں آیا تھا اور کوئی بات ایسی نہیں بن رہی تھی کہ بازار کی ویرانی ختم ہو کر دوبارہ گہما گہمی پیدا ہو جائے کہ ایک روز دو سوداگر بازار میں آئے۔ اور اُن دونوں نے خریداری شروع کر دی۔ حد یہ ہے کہ سوئی سے ہاتھی تک ہر چیز کے دام لگ گئے۔ اس خریداری کے نتیجے میں گھوڑے، خچر، بیل گاڑیاں، مزدور ہر شخص متحرک ہو گیا اور ان دونوں سوداگروں نے اعلان کیا کہ ہم پورے ایک ہفتے تک خریداری کریں گے۔ اور اپنی ضروریات کی فہرست کو اتنا طویل کر دیا کہ اس شہر کے سوداگروں نے رات دن کی کوششوں کے بعد دوسرے شہروں سے سامان کی فراہمی کا انتظام اور بندوبست کیا۔ ایک ہفتے میں ایسا

ماحول پیدا ہو گیا کہ شہر میں ہماہمی اور گہما گہمی ہو گئی۔ لوگ خوش حال ہو گئے۔ ان کے چہروں پر تازگی آ گئی۔ جو لوگ نقل مکانی کر گئے تھے وہ واپس آ گئے اور جن لوگوں نے نقل مکانی کا ارادہ کر لیا تھا، انہوں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ مزدور مالا مال ہو گئے۔ اضطراب، بے چینی، افلاس اور بھوک کا دَور دَورہ ختم ہو گیا۔ ایک ہفتے کی خریداری کے بعد سامان اٹھانے اور جہاز پر چڑھانے کا مسئلہ پیش آیا۔ لوڈنگ، اَن لوڈنگ کے سلسلے میں پوری مزدور برادری مصروفِ کار ہو گئی۔ اور اس طرح اجڑا ہوا شہر دوبارہ بس گیا۔ ان دونوں سوداگروں کے ساتھ ایک بڑے میاں بھی تھے جو محنت مزدوری کے سلسلے میں سوداگروں کے ساتھ لگ گئے تھے۔ جب خریدا ہوا سامان جہاز میں رکھ دیا گیا اور سوداگروں نے اس بوڑھے مزدور کو رخصت کیا تو بوڑھے مزدور نے کہا میں تنہا ہوں۔ میں آپ لوگوں کی خدمت کرتا رہوں گا اور اس طرح میری زندگی گزر جائے گی۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔ سوداگر اور مزدور جہاز میں سوار ہو گئے۔ جہاز چلتے چلتے جب سمندر کے بیچ میں پہنچا تو ان سوداگروں نے اس جہاز کو سمندر میں ڈبو دیا اور بوڑھے مزدور سے کہا کہ ہم دونوں فرشتے ہیں۔ چوں کہ ایک آباد بستی کاروبار نہ ہونے کی وجہ سے برباد ہو رہی تھی، اس لئے اللہ نے ہمیں حکم دیا کہ یہ بستی آباد رہنی چاہیئے تاکہ مخلوق کو رزق فراہم ہوتا رہے۔ یہ کہہ کر دونوں فرشتے غائب ہو گئے۔

آدم و حوّا کی تخلیق

آسمانی کتابوں کو پڑھنے اور ان کتابوں کی تعلیمات پر غور کرنے سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ آدم کو ایک جان سے تخلیق کیا گیا ہے۔ تخلیق کی اس بنیاد کو نفس، جان اور نقطۂ واحدہ کہا گیا ہے۔

عام حالات میں جب ہم تخلیق کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر نوع کا ایک آدم ہے۔ اور یہ ساری نوع آدم و حوّا سے وجود میں آئی ہے۔ جس طرح ایک آدمی کی نوع کا تعلق آدم و حوّا سے ہے اسی طرح بکری کی نوع کا تعلق بکرے اور بکری سے ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس کائنات میں ہر نوعی پروگرام اسی فارمولے پر قائم ہے۔ یعنی کسی وقت آدم و حوّا کا وجود تخلیق ہوا اور اس کی نسل چل پڑی۔ بیل، بکری، بھیڑ، کبوتر، بلّی، کتّا اور ننھے ننھے پرندوں کی تخلیق بھی ان کے آدم و حوّا سے وجود میں آئی۔ جس طرح باوا آدم سے آدمی بنا اسی طرح باوا طوطے سے طوطا بنا۔ باوا بکرے سے بکرے کی نسل چلی۔ اور باوا کبوتر سے کبوتر کی نسل وجود میں آئی۔ یہ تذکرہ ہے اس تخلیق کا جس تخلیق کو ہم گوشت پوست کا نام دیتے ہیں۔ پیدا ہونے والا ہر فرد وہ آدم ہو، بھیڑ ہو، بکری ہو، بندر ہو گوشت پوست کے عارضی جسم سے مرکب ہے کچھ عرصہ وہ نرم و نازک رہتا ہے۔ پھر اس کے اوپر جولانیت طاری رہتی ہے۔ پھر اعصاب اور اعضا خشک رہنے کے بعد یہ جسمانی نظام ختم ہو جاتا ہے۔ ان ہی کیفیات کو زندگی

اور موت کہا جاتا ہے لیکن ہمیں ہر لمحہ اور ہر آن یہ علم بھی منتقل ہوتا رہتا ہے کہ جسمانی وجود جس طرح ایک عارضی شے ہے اسی طرح وہ وجود جس کے اوپر جسمانی نظام کی بلڈنگ کھڑی ہوتی ہے، مستقل ہے۔ جب تک مستقل وجود جسمانی ڈھانچے کو سنبھالے رکھتا ہے، جسمانی بلڈنگ خوش نما خوب صورت اور متحرک رہتی ہے اور جب یہ اَن دیکھا وجود اس عارضی وجود سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس اَن دیکھے وجود کو اوتار اور پیغمبروں نے جان، نفس، نقطہ اور رُوح کے نام سے متعارف کرایا ہے۔

قلندریہ سلسلے سے جب رُوحانی دنیا کے مسافر کو قلندر شعور کی نسبت حاصل ہوتی ہے تو اس کے اندر کی آنکھ یہ دیکھ لیتی ہے کہ جان، نفس، نقطہ یا رُوح تخلیق کرنے والی ہستی کے وجود کا ایک حصّہ ہے۔ تخلیق کرنے والی ہستی کی تجلّی کا ایک وصف ہے۔ اور تجلّی کا وصف قدرت اور رحمت کے ساتھ اس جان، نفس یا نقطہ کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔

لہروں کا نظام

کائنات میں ہر موجود شے لہروں کے تانے بانے پر قائم ہے۔ اور یہ لہریں نور کے اوپر قائم ہیں۔ اللہ کی زبان میں زمین آسمان اللہ کا نور ہیں۔ تخلیق کی ایک حیثیت نورانی ہے اور تخلیق کی دوسری حیثیت روشنی، نفس، جان یا نقطہ ہے۔ ان لہروں یا تخلیق کے اندر نورانی وصف کو تلاش کرنے کے لئے اللہ کے دوستوں نے انسانی شعور کی مناسبت سے قاعدے بنائے ہیں۔ اور اس ایک نقطے کو چھ پر تقسیم کر دیا ہے تاکہ ایک مبتدی سالک آسانی کے ساتھ سمجھ سکے۔ اس نقطے کے چھ حصوں کے نام روحانیت میں

لطائف ستہ یا چھ لطیفے ہیں۔

پہلا لطیفہ جس کو 'اخفیٰ' کا نام دیا گیا ہے ہر انسان کے اندر 'نقطۂ واحدہ' ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جو اللہ کا گھر ہے، جس میں اللہ بستا ہے۔ جس نقطہ کے اوپر براہِ راست اللہ کی تجلیات کا نزول ہوتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس کے اندر داخل ہو جانے سے انسان کائنات کے اندر جاری و ساری نظام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور کائنات کے اوپر اس کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس میں داخل ہونے کے بعد اللہ کا یہ ارشاد سمجھ میں آجاتا ہے کہ ہم نے تمہارے لئے آسمانوں میں، زمین میں جو کچھ ہے سب کا سب مسخر کر دیا ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب تمہارا محکوم ہے۔ تم اس کے حاکم ہو۔ اور اس ارشاد کی تفصیل یہ سامنے آتی ہے کہ ہم نے تمہارے لئے سورج کو مسخر کر دیا، چاند کو مسخر کر دیا، ستاروں کو مسخر کر دیا۔ مسخر ہونے سے یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ چاند اور سورج کو اللہ نے مخلوق کی خدمت کے لئے ایک ڈیوٹی تفویض کی ہے۔ یہ بات ان کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کی خدمت بجا لائیں۔ چاند ہو، سورج ہو، ستارے ہوں، ہوا ہو، پانی ہو، گیس ہو، درخت ہوں، حیوانات ہوں، نباتات ہوں، جمادات ہوں سب انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔ یہ مسخر ہونا 'قلندر شعور' کی دانست میں مسخر ہونا نہیں ہے۔

اللہ نے ایک قانون بنا دیا ہے۔ اس قانون پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ ہر چیز انسان کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔ مسخر ہونا یا کسی چیز پر حاکمیت قائم ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس چیز پر تصرف کیا جا سکے حالاں کہ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ

نوعِ انسانی چاند اور سورج کے تصرف میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ اگر چاند اور سورج اپنا تصرف ختم کر سکتے تو زمین کا وجود قائم نہیں رہتا۔ مثلاً یہ کہ ہم دھوپ کے محتاج ہیں۔ غذاؤں میں شیرینی پیدا ہونے کے لئے ہم اس بات کے محتاج ہیں کہ چاند ہماری خدمت کرے۔ لیکن ہمیں چاند اور سورج پر کوئی حاکمیت اور تصرف حاصل نہیں ہے۔

رنگوں کی دنیا

ہم جب زمین کے اوپر موجود نت نئی تخلیقات پر تفکر کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ تخلیق کا عمل ظاہری نظروں سے دیکھا جائے تو ایک نظر آتا ہے۔ مثلاً ہم کسی درخت کی پیدائش کے بارے میں غور کرتے ہیں تو ہمیں زمین کے اوپر موجود تمام درختوں کی پیدائش کا لامتناہی سلسلہ ایک ہی طریقے پر قائم نظر آتا ہے۔ درخت چھوٹا ہو، بڑا ہو، تناور ہو، بیل کی شکل میں ہو یا جڑی بوٹیوں کی صورت میں ــ پیدائش کا سلسلہ یہ ہے کہ زمین کے اندر بیج بویا جاتا ہے۔ زمین اپنی کوکھ میں یا پیٹ میں اس بیج کو نشو و نما دیتی ہے اور بیج کی نشو و نما مکمل ہونے کے بعد درخت وجود میں آجاتا ہے۔ لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ پیدائش کا طریقہ ایک ہے، ہر درخت اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے اور درخت کی یہ انفرادیت نامکمل نہیں ہوتی۔ مثلاً آم اور بادام کے درخت کو دیکھا جائے تو درخت کی حیثیت سے وہ دونوں ایک ہیں۔ دونوں کی پیدائش کا طریقہ بھی ایک ہے، دونوں کا قد و قامت بھی ایک جیسا ہے لیکن آم کے درخت کا پھل اور بادام کے درخت کا پھل بالکل الگ الگ شکل و صورت میں موجود ہے۔ اسی طرح جب ہم پھولوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو پھول کا ہر درخت اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتا

ہے اور اس انفرادی حیثیت میں اس کے پتے بھی الگ ہوتے ہیں، اس کی شاخیں بھی الگ ہوتی ہیں۔ اور اس کے اندر پھول بھی الگ ہوتا ہے۔ پھولوں کی بے شمار قسموں پر جب نظر جاتی ہے تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ ہر پھول میں الگ خوشبو ہے۔ پھولوں میں ایسے گلینڈز ہوتے ہیں جن سے مختلف قسم کا خوشبودار تیل نکل کر ہوا میں اُڑتا رہتا ہے اور اس طرح فضا میں خوشبو پھیلتی رہتی ہے۔ پھولوں کے گلینڈز میں خوشبودار تیل کا ذخیرہ سونگھنے سے دماغ معطر ہو جاتا ہے۔ پھول اگر رنگین ہے تو ہر درخت کے پھول الگ الگ رنگ لئے ہوتے ہیں۔ رنگ سازی کا عالم یہ ہے کہ کوئی پھول اس قدر سُرخ ہوتا ہے کہ اس کے اوپر نظر جم جاتی ہے۔ پھولوں کے رنگوں میں کہیں سفید، کہیں سبز اور کہیں اُودا رنگ ہوتا ہے۔ بے شمار رنگ زمین میں سے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اللہ کی شان بھی کیسی عجیب شان ہے کہ زمین ایک ہے، ہوا ایک ہے، پانی ایک ہے، پیدائش کا طریقہ بھی ایک ہے لیکن ہر چیز ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اور دوسری بات جو بہت توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والی شے میں کسی نہ کسی رنگ کا غلبہ ضرور ہوتا ہے۔ کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو بے رنگ ہو۔ یہ رنگ اور بے رنگ دراصل خالق اور مخلوق کے درمیان ایک پردہ ہے۔ خالق کو مخلوق سے جو چیز الگ اور ممتاز کرتی ہے وہ رنگ ہے۔ انسان کے اندر جب تخلیقی صفات کا مظاہرہ ہوتا ہے یا اللہ اپنے فضل و کرم سے تخلیقی صلاحیتوں کا علم بیدار کر دیتا ہے تو بندے کے اوپر یہ بات منکشف ہو جاتی ہے کہ کوئی بے رنگ خیال جب رنگین ہو جاتا ہے تو تخلیق عمل میں آجاتی ہے۔ اللہ بحیثیت خالق کے ورائے بے رنگ ہے۔

اللہ نے جب کائنات کو بنانے کا ارادہ فرمایا تو جو کچھ اللہ کے ذہن میں موجود تھا اس کا ارادہ کیا اور کہا "ہوجا" اور وہ چیز ہو گئی۔ یعنی ورائے بے رنگ سے نزول کر کے اللہ کے خیال نے ایک رنگ اختیار کیا۔ جس کو سمجھنے کے لئے روحانیت نے بے رنگی کا نام دیا ہے یعنی ایسا رنگ جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس بے رنگی میں حرکت پیدا ہوئی تو رنگین وجود تخلیق میں آگیا۔ اور یہی وجود مختلف صورتوں میں اور مختلف رنگوں میں اور مختلف صلاحیتوں کے ساتھ مجسم اور متشکل ہو گیا۔

کائنات کی تخلیق میں بنیادی عنصر یا بنیادی مسالا رنگ ہے۔ اور رنگوں کا امتزاج ہی تخلیقی فارمولے ہیں۔ رنگوں کی مناسبت سے یا ان رنگوں کی کمی بیشی سے مختلف تخلیقات عمل میں آتی ہیں۔ انسان جو مخلوقات میں اللہ کی سب سے اچھی تخلیق ہے اور جس کو اللہ نے تخلیقی حیثیت میں اپنا نائب قرار دیا ہے، اس کی اصلیت بھی رنگوں سے مرکب ہے۔ اس تخلیق کو سمجھنے کے لئے روحانیت نے چھ دائرے متعین کئے ہیں۔ اور ہر دائرہ الگ الگ رنگوں سے مرکب ہے۔ روحانیت میں ان دائروں کو جب روشنیوں سے معمور کیا جاتا ہے تو "لطائف کا رنگین ہونا" کہتے ہیں۔

روشنیوں کے چھ قمقمے

انسان گوشت پوست اور ہڈیوں کے ڈھانچے کا نام نہیں ہے۔ انسان کے اوپر ایک اور روشنیوں کا بنا ہوا جسم ہوتا ہے جس کو قلندر بابا اولیاءؒ نے نسمہ (AURA) کا نام دیا ہے۔ نسمہ یا اَورا چھ نقطوں یا چھ دائروں سے بنا ہوا ہے۔ چھ دائروں سے تین روحیں وجود میں آتی ہیں۔ ان چھ دائروں کا نام اخفیٰ، خفی، سر، روح، قلب اور نفس ہے اور تین روحوں کا نام رُوحِ حیوانی، رُوحِ انسانی اور رُوحِ اعظم ہے۔

چھ نقطوں، چھ دائروں یا روشنیوں کے مقاموں کو روحانیت میں لطیفے یا جزیٹر کہا جاتا ہے۔ ہر دو لطیفوں سے ایک روح بنتی ہے۔

لطیفۂ نفسی اور لطیفۂ قلبی سے روح حیوانی بنتی ہے۔

لطیفۂ سرّی اور لطیفۂ روحی سے روحِ انسانی وجود میں آتی ہے۔

لطیفۂ خفی اور لطیفۂ اخفیٰ سے روحِ اعظم کی تشکیل ہوتی ہے۔

لطیفۂ نفسی اور لطیفۂ قلبی سے بننے والی حیوانی روح پر ہمیشہ زرد رنگ غالب رہتا ہے۔ لطیفۂ روحی اور لطیفۂ سرّی سے انسانی روح پر سبز رنگ کا غلبہ ہوتا ہے اور لطیفۂ خفی اور لطیفۂ اخفیٰ سے مرکب روحِ اعظم پر نیلا رنگ غالب ہوتا ہے۔ جس قدر زرد رنگ کا غلبہ زیادہ ہو جائے گا اسی مناسبت سے آدمی کے اوپر دنیاوی خواہش کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ روحانیت میں مراقبہ اس لئے کرایا جاتا ہے کہ آدمی کے اوپر سے زرد رنگ کی گرفت کم ہو جائے۔ زرد رنگ کی گرفت کم ہونے سے آدمی کا ذہن سبز روشنیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ سبز روشنیاں اُسے سکون دیتی ہیں۔ اور ذہنی ارتکاز میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جب سبز روشنیوں پر ذہنی ارتکاز ہو جاتا ہے تو ذہن نیلی روشنیوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔

ترکِ دنیا کیا ہے

اللہ نے انسانی ذہن کی تخلیق کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ کسی جگہ ٹھہرتا نہیں ہے۔ بے رنگی سے نکل کر وہ ورائے بے رنگ کا مشاہدہ کر لیتا ہے اور یہی اللہ کی ذات کا عرفان ہے۔ قلندر شعور ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ انسان اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اوپر ایسی کیفیات اور واردات محیط کر سکتا ہے جو اسے دنیاوی خیالات سے آزاد کر دیں۔ دنیاوی خیالات

سے آزاد ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کھانا پینا چھوڑ دے، کپڑے نہ پہنے، گھر میں نہ رہے، شادی نہ کرے۔ دنیاوی خیالات سے آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں ذہن کا انہماک نہ ہو۔ دنیاوی معاملات کو روٹین کے طور پر پورا کرے۔ مثلاً ایک آدمی کی ضرورت ہے کہ وہ پانی پئے۔ اُسے جب پیاس لگتی ہے وہ پانی پی لیتا ہے۔ لیکن وہ تمام دن اپنے اوپر پیاس کو مسلط نہیں رکھتا۔ پانی کا تقاضا پیدا ہوا، پانی پیا اور بھول گیا۔ یہی صورتِ حال سونے اور جاگنے کی ہے۔

جب کوئی بندہ کسی ایک، دو، دس، بیس، پچاس خیالات میں اس طرح گھر جاتا ہے کہ اس کا ذہن معمول (ROUTINE) سے ہٹ جائے تو وہ بے رنگی سے دور ہو کر رنگوں کی دنیا میں مصروف ہو جاتا ہے اور جب کوئی بندہ دنیاوی ضروریات کے تمام اعمال و افعال کو روٹین کے طور پر انجام دیتا ہے تو وہ رنگوں کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی بے رنگ دنیا کی طرف سفر کرتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک شاگرد نے حضرت جنید بغدادیؒ سے سوال کیا کہ ترکِ دنیا کیا ہے؟ حضرت جنیدؒ نے جواب دیا۔ "دنیا میں رہتے ہوئے آدمی کو دنیا نظر نہ آنا۔"

شاگرد نے پوچھا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

حضرت جنیدؒ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں جب تمہاری عمر کا تھا، میں نے اپنے پیر و مرشد سے یہی سوال کیا تھا تو انہوں نے جواب دیا ——

آؤ بغداد کے سب سے مشہور بازار کی سیر کریں۔ چنانچہ میں اور شیخ بغداد کے مصروف ترین بازار کی طرف نکل گئے۔ جیسے ہی ہم بازار کے صدر دروازے میں داخل ہوئے، میں نے دیکھا کہ میں اور میرے شیخ ایک ویرانے میں کھڑے ہیں۔ حدِ نظر تک

ریت کے ٹیلوں اور بگولوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ "شیخ! یہاں بازار تو نظر نہیں آرہا۔"

شیخ نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "جنید! ابھی ترکِ دنیا ہے کہ آدمی کو دنیا نظر نہ آئے۔ اُون کے لبادے اوڑھ لینا، جَو کی روٹی کھا لینا اور عالی شان مکانوں سے منہ موڑ کر جنگلوں میں نکل جانا ترکِ دنیا نہیں ہے۔ ترکِ دنیا یہ ہے کہ لذیذ ترین اشیا بھی کھاؤ تو جَو کی روٹی کا ذائقہ ملے۔ اطلس و دیبا اور حریر بھی پہنو تو ٹاٹ کا لباس محسوس ہو۔ گنجان بازاروں اور خوبصورت محلات کے درمیان سے گزرو تو بیابان نظر آئے۔ لیکن جنید! یہ سب باتیں پڑھنے سے اور دوسروں کو سمجھانے سے اس وقت تک سمجھ میں نہیں آئیں گی جب تک تم ترکِ دنیا کے تجربے سے نہ گزرو۔ آؤ، اب گھر چلتے ہیں۔" پھر جیسے ہی ہم اس ہولناک ویرانے سے گھر کے لئے روانہ ہوئے ہم بغداد کے اس بارونق بازار کے صدر دروازے پر کھڑے تھے۔

زمان و مکان

قلندر شعور ہمیں بتاتا ہے کہ ذہن کو دنیاوی علائق اور دنیاوی معاملات سے یکسو کرنے کے لئے ایسی مشقوں کی ضرورت ہوتی ہے جن مشقوں سے ذہن دنیا کو عارضی طور پر چھوڑ دے اور ان مشقوں سے جب ذہن یکسو ہو جاتا ہے یعنی ذہن میں سے دنیا کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ دنیاوی معاملات روٹین کے طور پر پورے ہوتے ہیں تو آدمی کے اندر اس کی روحانی صلاحیتیں بیدار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ جب ان بیدار صلاحیتوں میں ذہنِ انسانی بہت زیادہ متوجہ ہو جاتا ہے تو شعور کے اوپر سے زرد رنگ کا خلیہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں زمان و مکان کی حد بندیاں

اس طرح ختم ہو جاتی ہیں کہ آدمی بیدار ہوتے ہوئے بھی ایسے عمل کرنے لگتا ہے جس طرح کے عمل یا جس طرح کے کام وہ خواب کی زندگی میں کرتا ہے۔ اسے مراقبہ کے اندر آنکھیں بند کئے ہوئے پوری طرح یہ احساس ہوتا ہے کہ میں جسمانی طور پر موجود ہوں، جسمانی طور پر زمین پر بیٹھا ہوا ہوں اور اس کے باوجود میں چل پھر رہا ہوں اڑ رہا ہوں اور فاصلوں کی نفی کر کے دور دراز چیزوں کو دیکھ رہا ہوں۔

خواب اور مراقبہ

خواب اور مراقبے میں فرق یہ ہے کہ خواب میں دماغ یا شعور جسمانی اعضا کو نظر انداز کر دیتا ہے اور مراقبے میں شعور جسمانی اعضا کو نظر انداز نہیں کرتا۔ مراقبہ کرنے والا بندہ جس کی آنکھ کھلی ہے (آنکھ سے مراد اندر کی آنکھ ہے یا رُوحِ حیوانی کی آنکھ ہے) تو ٹائم اسپیس یا زمان و مکان کو حذف کرتے ہوئے جسمانی کیفیات سے آشنا رہتا ہے۔ مراقبے کو ہم خواب کا پہلا درجہ کہتے ہیں۔ یعنی ایسا خواب جس میں آدمی کے اوپر نیند غالب نہ ہو اور وہ مکمل طور پر بیدار رہے۔

مراقبہ کی قسمیں

ماورائی دنیا کو دیکھنے کا عمل ابتدائی درجوں میں چار طریقوں پر قائم ہے۔

روحِ حیوانی دو نقطوں سے مرکب ہے۔ ایک نقطے کا نام نفس ہے اور دوسرے نقطے کا نام قلب ہے۔ شعورِ انسانی جب تک نفس کے اندر دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے یا دنیا کو دیکھتا ہے تو وہ زمان و مکان میں پابند رہتے ہوئے بیداری میں دیکھتا ہے۔ اس سے ترقی کر کے آدمی جب رُوحِ حیوانی سے اوپر قلب میں دیکھتا ہے تو ٹائم اسپیس کی گرفت ٹوٹنے لگتی ہے اور مادی دنیا اور غیب کی دنیا ایک ساتھ اس کی

نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ لطیفۂ نفسی اور لطیفۂ قلبی کی ان دو سیڑھیوں سے گزر کر جب آدمی تیسری سیڑھی پر قدم رکھتا ہے یعنی لطیفۂ روحی میں دیکھتا ہے تو یہ دیکھنا مراقبے میں دیکھنا ہے۔

مراقبے کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مراقبہ کی ایک قسم یہ ہے کہ آدمی آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اُسے ذہنی یکسوئی نصیب ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز اس کی نظروں کے سامنے آتی ہے۔ لیکن بندہ دیکھی ہوئی چیز میں معانی اور مفہوم نہیں پہنا سکتا۔ دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ جس وقت کوئی چیز نظر آتی ہے، اس وقت شعور اور حواس معطل ہو جاتے ہیں اور وہ جب اس کیفیت سے نکلتا ہے تو اس کے ذہن پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی چیز دیکھی ہے۔ کیا دیکھی ہے، کس طرح دیکھی ہے یہ بات اس کے حافظے پر کسی طرح نقش نہیں ہوتی۔ اس کو روحانیت میں "بیداری میں خواب دیکھنا" کہتے ہیں۔ اور بیداری میں خواب دیکھنے کا اصطلاحی نام غنود ہے۔ اس کے بعد دوسرا اسٹیج یہ ہے کہ آدمی نے مراقبہ میں ہوش و حواس کو قائم رکھتے ہوئے کوئی چیز دیکھی۔ اس کو ایک جھٹکا سا لگا اور یہ بات ذہن میں آئی کہ میرا وجود موجود ہے۔ وجود کی موجودگی کے ساتھ ساتھ دیکھی ہوئی چیز کچھ یاد رہی، کچھ بھول میں پڑ گئی۔ اس کیفیت کو روحانی اصطلاح میں "ورود" کہا جاتا ہے۔ بیداری کے حواس میں اس طرح کسی چیز کا دیکھنا کہ وہ یاد بھی رہے اور اس کے معانی اور مفہوم بھی ذہن نشیں ہو جائیں۔ جسمانی وجود کا احساس بھی باقی رہے اور ٹائم اسپیس کی گرفت بھی ٹوٹ جائے، اس کیفیت کا نام مراقبہ ہے۔

زندگی ایک اطلاع ہے

عام مشاہدے کی رُو سے زندگی گزارنے کی جو طرزیں موجود ہیں یا ہر آدمی زندگی کی جن طرزوں میں سفر کرتا ہے، وہ دو ہیں۔ ایک طرز یہ ہے کہ آدمی شعوری حواس میں زندگی کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے لیکن ساتھ ساتھ ہر تقاضا پورا کرنے کے لئے اُسے جسمانی طور پر محنت اور جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ جب تک جسمانی اعضا اپنا وظیفہ پورا نہیں کرتے، اس وقت تک تقاضے کی تکمیل نہیں ہوتی۔ جسمانی اعضا سے مراد ہاتھ، پیر، کان، ناک، آنکھیں وغیرہ وغیرہ ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم اس بات سے بھی قطع نظر نہیں کر سکتے کہ جسمانی اعضا دماغ کے تابع ہیں۔ دماغ جب تک متحرک نہیں ہوتا، اعضا میں حرکت نہیں ہوتی اور دماغ کی حرکت خیال کے تابع ہے۔ جب تک دماغ کے اندر کوئی خیال وارد نہیں ہوتا اس وقت تک دماغ جسمانی اعضا کو کوئی حکم نہیں دیتا، کوئی ترغیب (INSPIRATION) نہیں دیتا۔

خیال کیا ہے؟ خیال دراصل تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ایک اطلاع ہے۔ مثلاً دماغ بتاتا ہے کہ اب سو جاؤ اس لئے کہ مزید جاگنا جسم کے لئے مناسب نہیں ہے۔ پھر دماغ کہتا ہے کہ اب بیدار ہو جاؤ اس لئے کہ اس سے زیادہ سونا جسمانی کارکردگی کے لئے مضر ہے۔ دماغ کہتا ہے کہ اب کھانا کھاؤ اس لئے کہ اگر کھانا نہیں کھایا گیا تو زندگی میں ایندھن بننے والی کیلوریز (CALORIES) ختم ہو جائیں گی۔ علیٰ ہٰذا القیاس زندگی کے تمام تقاضے پورا کرنے کے لئے دماغ احکامات صادر کرتا رہتا ہے۔ اور ان احکامات کی پیروی پورا جسم کرتا ہے۔ دماغ جو احکامات دیتا ہے اس کا تعلق اطلاع سے ہے لیکن دماغ کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ یہ اطلاع کہاں سے آرہی ہے۔

دماغ صرف اس حد تک باخبر ہے کہ اُسے اطلاع ملتی ہے۔ وہ اطلاع میں جسمانی تقاضوں کے تحت معانی پہنا دیتا ہے اور معانی پہنا کر جسم کے اندر جو مشین فٹ ہے اس کو اطلاع دیتا رہتا ہے۔ مشین اس پر عمل درآمد کرنے پر مجبور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے تقاضوں کی اصل بنیاد اطلاع ہے۔ اطلاعات میں معانی پہنانے کی دو طرزیں ہیں۔ ایک طرز میں حواس زمان و مکان کے پابند ہیں لیکن دوسری طرز میں حواس معانی پہنانے میں زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزاد ہیں۔ جس طرح جسمانی اعضا کو کنٹرول کرنے کے لئے جسم کے اندر ایک دماغ ہے اور وہ دماغ اطلاعات قبول کر کے اس میں معانی پہناتا ہے اسی طرح روحانی دماغ جن اجزائے ترکیبی سے مرکّب ہے، یہ اجزائے ترکیبی زمان و مکان سے آزاد ہیں۔

مثال: جسمانی دماغ ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ جسم کو انرجی حاصل کرنے کے لئے روٹی کھانے کی ضرورت ہے۔ ہم جب اس اطلاع کی تکمیل کرتے ہیں تو ہمیں تواتر اور تسلسل کے ساتھ کئی حد بندیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ہم گندم بوئیں گے، پھر اس کی حفاظت کر کے اس کو پروان چڑھائیں گے، پھر اس کو کاٹ کر بالیوں میں سے الگ کریں گے۔ پھر چکّی پر پسوائیں گے۔ پھر آٹا گوندھ کر روٹی پکائیں گے اور پھر روٹی کھائیں گے۔ یہ جسمانی دماغ کی اطلاع میں معانی پہنانے کا عمل ہے۔ اس کے برعکس روحانی دماغ جب ہمیں کسی چیز کے کھانے کی اطلاع فراہم کرتا ہے تو ہمیں ان تمام حد بندیوں سے گزرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جیسے ہی روحانی دماغ میں یہ اطلاع آئی کہ کچھ کھانا چاہیئے، ساتھ ہی اطلاع میں یہ معانی پہنائے گئے کہ روٹی کھانی چاہیئے اور فوراً ہی اس کی تکمیل ہو گئی۔ گندم بونا، کاٹنا، پیسنا اور روٹی پکانا سب

باتیں حذف ہو گئیں۔ روحانی دماغ خواب میں کام کرتا ہے۔ اور مشق کے بعد مراقبہ بن جاتا ہے۔ جس طرح کوئی آدمی روحانی دماغ کی اطلاع قبول کر کے وسائل کی محتاجی کے بغیر روٹی کھا لیتا ہے، اسی طرح کوئی بندہ جو مراقبے کے عمل سے واقف ہے یا اس کے اندر روحانی دماغ متحرک ہو گیا ہے تو اس کے اندر سے زمان و مکان کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے۔ جس طرح بیداری میں روٹی کھانے کے لئے مختلف مدارج سے گزرنا پڑتا ہے، اسی طرح سفر کرنے کے لئے بھی مختلف مدارج سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ہمیں کراچی سے لندن جانا ہے۔ گھر سے باہر نکلیں گے۔ رکشہ یا ٹیکسی میں بیٹھ کر ائرپورٹ پہنچیں گے۔ ہوائی جہاز میں سوار ہوں گے اور فضا میں تیرتے ہوئے لندن پہنچیں گے۔ لیکن یہی سفر اگر ہم مراقبے کی حالت میں کریں گے تو نہ گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت ہو گی، نہ ٹیکسی رکشہ کی حاجت پیش آئے گی اور نہ ہوائی جہاز میں بیٹھنا عمل میں آئے گا۔ مراقبے میں انسان خیال کی رفتار سے سفر کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ کراچی میں بیٹھے ہوئے آدمی نے اس بات کا ارادہ کیا کہ مجھے دہلی جانا ہے اور وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کی مثال ہر آدمی کے اوپر خواب میں گزرتی ہے۔ ایک آدمی کراچی میں خواب دیکھتا ہے کہ وہ دہلی میں ہے۔ وہ دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے مزار پر مراقبہ کر رہا ہے۔ دہلی کی فضا سے پوری طرح باخبر اور متاثر ہے۔ گھر کے کسی آدمی نے پیر ہلا دیا۔ اب وہ کراچی میں موجود ہے۔

مراقبہ کی چار کلاسیں

ہم نے مراقبہ کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ یہ چار قسمیں در اصل چار ابتدائی کلاسیں یا چار سیڑھیاں ہیں۔ ان چار کلاسوں کو پڑھ کر یا ان چار سیڑھیوں سے گزر کر قلندر شعور کا مسافر جب پانچویں درجے میں

داخل ہوتا ہے تو وہ الہامی کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی آدمی اہتمام کرکے کسی جگہ بیٹھے اور آنکھیں بند کرکے اپنے ارادے یا اختیار سے اپنے روحانی جسم کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرے یا زمین سے عرش پر منتقل ہو۔ الہامی کیفیت بیٹھتے اٹھتے، چلتے پھرتے، باتیں کرتے کسی بھی حالت میں طاری ہو سکتی ہے۔ اس کیفیت میں اگر پہلا دماغ جس کو ہم نے بیداری کا دماغ اور شعور کہا ہے، قلندر شعور سے وابستہ ہے تو آدمی بیداری میں کام کرتے ہوئے بھی دوسری دنیا کا نہ صرف مشاہدہ کرتا ہے بلکہ دوسری دنیا کے معاملات میں دلچسپی بھی لیتا ہے۔ اور جس طرح بیداری میں زندگی گزارتا ہے اسی طرح دوسری دنیا میں بھی زندگی سرگرم عمل رہتی ہے۔ یہ ایسی حالت ہوتی ہے جس میں شعور اور لاشعور بہ یک وقت کام کرنے لگتے ہیں۔ لیکن الہامی کیفیت میں کوئی کیفیت مستقل نہیں ہوتی۔ وقفہ کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہفتوں مہینوں الہامی کیفیت نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوبیس گھنٹے میں چوبیس مرتبہ الہامی کیفیت طاری ہو جائے۔ بہر حال یہ اطلاع میں ایسے معانی پہنانے کا عمل ہے جو شعور اور لاشعور دونوں میں بہ یک وقت جاری و ساری ہے۔

پیدا ہونے سے پہلے کی زندگی

یہ بات غور طلب ہے کہ اس دنیا (عالم ناسوت) میں آنے سے پہلے روح کہاں موجود تھی۔ اس لئے کہ جب ہم لفظ 'آنا' استعمال کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ کہیں کوئی چیز موجود ہے۔ جب یہ بات طے ہو گئی کہ کوئی چیز کہیں موجود ہے تو یہ بات زیر بحث آتی ہے کہ وہ چیز کس صورت اور کن خد و خال میں موجود ہے۔ جب

صورت اور خد و خال کا تذکرہ ہوتا ہے تو صورت اور خد و خال کے لئے کسی مقام کا تعین بھی ضروری ہے۔ مقام کے تعین کے ساتھ ساتھ ٹائم اسپیس زیر بحث آجاتا ہے۔

ہم پیدا ہونے سے پہلے کہاں تھے؟ اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے تمام انسان، حیوانات عالم ارواح میں موجود تھے۔ عالم ارواح سے منتقل ہو کر عالم ناسوت (مادی دنیا) میں آگئے۔ لیکن جب ہم عالم ارواح کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ بات تشریح طلب بن جاتی ہے کہ عالم ارواح کیا ہے؟ عالم ارواح کا علم لامتناہی علم ہے لیکن اللہ نے جن لوگوں کو یہ علم عطا کیا ہے وہ اس علم سے روشناس ہیں۔ اور یہ علم اپنے شاگردوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔

چھپا ہوا خزانہ

آسمانی صحائف کے نقطۂ نظر سے جب ہم تخلیقِ کائنات پر تفکر کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ ہم مخلوق ہیں اور اللہ ہمارا خالق ہے۔ خالق نے جب چاہا کُن فرما کر کائنات کو بنا دیا۔ سوال یہ ہے کہ خالق نے کیوں چاہا اور خالق نے جو چاہا وہ پہلے سے موجود تھا یا نہیں؟ اگر خالق کا چاہنا موجود تھا تو وہ کہاں تھا اور خالق نے کائنات کیوں بنائی؟ اس کے بارے میں خالق خود کہتا ہے "میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے مخلوق کو محبت کے ساتھ اس لئے پیدا کیا کہ میں پہچانا جاؤں۔"

مخلوق جو کچھ اور جس طرح موجود ہے، اس کی موجودگی کے بارے میں بھی خالق خود بتاتا ہے کہ میں نے مخلوق کو اپنی صفات پر پیدا کیا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ ذات کو صفات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ صفات ذات کے اندر موجود ہوتی ہیں اور صفات سے ہی ذات کا تعارف ہوتا ہے۔

لوحِ محفوظ

تمام آسمانی صحائف اور الہامی کتابیں وہ صحفِ ابراہیمی ہوں، زبور ہو، انجیل ہو، تورات ہو، گیتا ہو یا آخری کتاب قرآن ہو، ہر کتاب اور الہامی تحریر ہمیں یہ علم عطا کرتی ہے کہ زندگی کے تقاضے، زندگی کے تمام اعمال و حرکات اور زندہ رہنے کی کل طرزیں زندگی کے تمام زمانے اور نشیب و فراز "کُن" کے ساتھ ایک سطح پر نقش ہو گئے۔ یعنی کائنات اور کائنات کی زندگی کامل طرزوں کے ساتھ ایک ریکارڈ کی حیثیت میں موجود ہے۔ جس جگہ، جس سطح پر یا جس اسکرین پر کائنات اپنے پورے خدوخال کے ساتھ ریکارڈ ہے یا محفوظ ہے، الہامی کتابیں اُسے "لوحِ محفوظ" کا نام دیتی ہیں۔

زمین کی سطح پر جو کچھ مظاہرہ ہو رہا ہے وہ دراصل لوحِ محفوظ پر بنی ہوئی فلم کا مظاہرہ (DISPLAY) ہو رہا ہے۔ سائنسی زبان میں اس بات کو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ایک پروجیکٹر ہے۔ اس پروجیکٹر پر ایک فلم لگی ہوئی ہے۔ وہ فلم جب چلتی ہے تو جہاں جہاں اسکرین موجود ہے وہاں وہاں یہ فلم نظر آتی رہتی ہے۔ اس قانون سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہماری زمین کی طرح بے شمار زمینیں موجود ہیں۔ جس طرح ہماری زمین پر انسانی آبادی ہے، اسی طرح کائنات میں موجود بے شمار سیاروں پر بھی انسان آباد ہیں اور وہاں بھی زندگی گزارنے کے تمام وسائل موجود ہیں۔

اَللّٰہ کی تجلّی ۔ پروجیکٹر پر ایک فلم لگی ہوئی ہے۔ پروجیکٹر کی فلم اس وقت تک اسکرین پر

منعکس نہیں ہوتی جب تک کہ پروجیکٹر کو کوئی روشنی فیڈ (FEED) نہ کرے۔ لوحِ محفوظ پر چلنے والی فلم کو جو روشنی متحرک کرتی ہے وہ اللہ کی تجلّی ہے۔ اللہ کی اس تجلّی کا عکس براہِ راست لطیفۂ اخفیٰ پر پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب کوئی بندہ اپنے اندر موجود لطیفۂ اخفیٰ کو دیکھ لیتا ہے یا اپنے اندر موجود لطیفۂ اخفیٰ سے واقف ہو جاتا ہے تو دراصل وہ اللہ کی تجلّی کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ اس کے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ "کُن" کہنے سے پہلے عالمِ موجودات کی کیا حیثیت تھی اور "کُن" کہنے کے بعد کائنات کی کیا حیثیت ہے۔

کائنات پر حکمرانی

اللہ کہتا ہے میں تمہاری رگِ جاں سے زیادہ قریب ہوں۔ رگِ جاں غیب ہے۔ اور انسان کے اندر موجود ہے۔ یعنی انسان کے اِنر (INNER) میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جس کو زندگی کی بنیاد (BASE) قرار دیا جاتا ہے۔ اگر وہ چیز انسان کے اندر موجود نہ رہے تو زندگی تلف ہو جاتی ہے۔ جب سالک اپنی رگِ جاں کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو اللہ کی قربت کا احساس اس کے اندر جاگ اٹھتا ہے اور وہ خود کو اللہ کے قریب محسوس کرتا ہے۔ اللہ کو پہچان لیتا ہے۔ اللہ کو پہچاننے کے لئے پہلے خود کو پہچاننا ضروری ہے۔ خود کو پہچاننا دراصل کائنات کے رموز کو جاننا اور پہچاننا ہے۔ کائنات کے رموز سے واقفیت کائنات کے اوپر حکمرانی ہے۔ کائنات پر حکمران بندہ ہی اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔

روحانیت محض اس عمل کا نام نہیں ہے کہ کسی اسم کا ورد کر لیا یا محض ذکر و فکر میں آدمی زندگی گزار دے۔ روحانیت کا اصل منشاء اور مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی ذات (INNER) سے واقف ہو جائے۔

روشنی کی چار نہریں

سائنسی نقطۂ نظر سے چھ لطیفوں کی تشریح کی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ چھ لطیفے یا چھ جنریٹرز ہیں جن کے اندر دَور کرنے والی روشنیاں وہم بنتی ہیں، خیال بنتا ہیں، تصوّر بنتی ہیں اور پھر شکل و

صورت کے ساتھ مظہر بن جاتی ہیں۔ اس بات کی زیادہ وضاحت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس بات پر بھی روشنی ڈالیں کہ ان چھ نقطوں یا چھ دائروں یا چھ جنریٹرز میں جو روشنیاں، خیالات، تصوّرات اور احساسات بنتے ہیں ان کا منبع (SOURCE) کیا ہے۔ اور یہ روشنیاں کہاں سے آتی ہیں اور کس طرح ان نقطوں کو یا ان روشن دائروں کو فیڈ کرتی ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہم چھ دائروں کو دوہرا کر کے تین دائروں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ان تین دائروں یا چھ رخوں کو چار نورانی نہریں فیڈ کرتی ہیں۔

روشنی کی پہلی نہر کا نام **تطہیر** ہے۔
روشنی کی دوسری نہر کا نام **تشہید** ہے۔
روشنی کی تیسری نہر کا نام **تجرید** ہے۔
اور روشنی کی چوتھی نہر کا نام **تسوید** ہے۔

یہ تین نہریں اور ایک نورانی آبشار پیدائش سے پہلے کی زندگی میں، پیدائش کے بعد کی زندگی میں، مرنے کے بعد کے عالمِ حشر و نشر، جنت دوزخ اور ازل سے اَبد کے پروگرام کو ہر آن اور ہر لمحہ فیڈ کرتی رہتی ہیں۔ اور نورانی نہروں کے یہ انوار اور روشنیاں ہی وہم، خیال، تصوّر، احساس اور مظہر بنتی رہتی ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ دائرے یا جنریٹرز تین ہیں اور نہریں چار ہیں۔ یہ نہریں کیا ہیں، ان نہروں کے تخلیقی فارمولے کس طرح سرگرمِ عمل ہیں، ان روشنیوں سے یا ان انوار سے اللہ کی کون کون سی صفات کا تعلق ہے، وہ کون کون سے روحانی علوم ہیں جو ان نہروں میں ذخیرہ ہیں۔ یہ ایک ایسا علم ہے جو بندہ کو اللہ خود پڑھاتا ہے۔

نیابت اور خلافت

قلندر شعور کی تعلیمات کے مطابق انسان کی فضیلت اور کائنات میں دُوسری مخلوقات کی نسبت اس کا ممتاز ہونا اور اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے انسان کا متصف ہونا اور انسان کے لئے ملائکہ کا مسجود ہونا اور انسان کے لئے کائنات کا مسخّر ہونا اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کو اللہ نے اپنی ان صفات کا علم عطا کر دیا ہے جو کائنات میں موجود دوسری کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو جان کر پڑھ کر کوئی بندہ کائنات میں اپنی ممتاز حیثیت سے واقف ہوجاتا ہے۔ یہ سارا کا سارا علم اس نظام سے متعلق ہے جس نظام کے تحت کائنات چل رہی ہے۔ ایک صاحبِ علم بندہ اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ سورج کیا ہے، چاند کیا ہے، ستارے کیا ہیں، فرشتوں کی مخلوق کیا ہے، اللہ نے جنّات کو کس شکل و صورت میں پیدا کیا ہے اور جنّات کی عادات و اطوار کیا ہیں۔ ایک نظامِ شمسی میں کتنے سیّارے کام کرتے ہیں اور ایک کہکشاں میں کتنے نظامہائے شمسی متحرک ہیں۔ وہ بندہ جو اللہ کی امانت کے علم کا امین ہے یہ جان لیتا ہے کہ اللہ کی تخلیق میں اللہ کی صفات اور اللہ کی مشیّت کا کس طرح عمل دخل ہے۔ اس کے علم میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ آدمی مرنے سے پہلے عالمِ ناسُوت کی زندگی کن تخلیقی فارمولوں کے تحت گزارتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ پیدائش سے پہلے آدمی کہاں تھا، پیدائش سے پہلے آدم زاد جہاں تھا اس سے

پہلے کا عالم کیا ہے؟ اگر اس عالم کا نام "برزخ" ہے تو برزخ سے پہلے کون سا عالم ہے۔ برزخ سے پہلے کے عالم کا نام اگر عالمِ ارواح ہے تو عالمِ ارواح سے پہلے کون سا عالم ہے۔ عالمِ ارواح میں کائنات کی ساخت کیا ہے اور عالمِ ارواح سے پہلے کائنات کس طرح وجود پذیر ہے۔ 'کُن' کے بعد کائنات اور کائنات کے افراد نوعی اعتبار سے کس قسم کے حواس اور کس قسم کا ادراک رکھتے ہیں۔ اور 'کُن' سے پہلے افرادِ کائنات کی حیثیت کیا تھی۔ یہ بات بھی اس کے علم میں ہوتی ہے کہ پیدا ہونے کے بعد سے قیامت تک کی زندگی کن ضابطوں پر قائم ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک وجُود کے اوپر روشنیوں کے کتنے غلاف چڑھے ہوتے ہیں۔ اللہ کے اس علم کی بدولت اس کے مشاہدے میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ روشنیوں کے وجود کے اوپر نور کے کتنے غلاف ہیں۔ نور اور تجلّی میں کیا فرق ہے۔ تجلّی اور تدلّی کیا ہے۔ یہ سب علوم اُسے اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب وہ اس علم سے واقف ہوجاتا ہے جس علم کو اللہ نے اپنی امانت قرار دیا ہے، ایسی امانت جو صرف انسان کو حاصل ہے۔ یہ وہی امانت ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ نیابت اور خلافت کا مفہوم یہ ہے کہ جو جس کا نائب ہوتا ہے اس کے اختیارات اُسے حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ خالق ہے۔ اللہ کے اپنے ذاتی اختیارات تخلیقی ہیں۔ انسان جب زمین پر اللہ کا نائب بنا دیا گیا تو اسے بھی اللہ کے تخلیقی اختیارات منتقل ہوگئے۔ ان ہی تخلیقی اختیارات کو نافذ کرنے والے بندوں کے گروہ کو "اہلِ تکوین" کہا جاتا ہے۔

آدم اور ملائکہ

اللہ نے آدم کو علم الاسماء سکھا دیا یعنی اپنی صفات کی حقیقت سے آدم کو آشنا کر دیا۔ اور فرشتوں سے پوچھا کہ اگر

تم جانتے ہو تو بیان کرو۔ فرشتوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ہم صرف اس حد تک جانتے ہیں جو آپ نے ہمیں بتا دیا ہے۔ یعنی آدم کی حیثیت علمی اعتبار سے فرشتوں سے زیادہ ہے۔ اللہ اور فرشتوں کی اس علم و آگہی کی گفتگو میں تین ہستیاں موجود ہیں۔ ایک آدم، دوسری ہستی فرشتوں کی اور تیسری ہستی خود اللہ کی ذات۔ آدم اللہ کو بھی دیکھ رہا ہے۔ اس کے سامنے فرشتے بھی ہیں۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ اللہ نے جو علم مجھے عطا کر دیا ہے، وہ فرشتے نہیں جانتے۔ نہ صرف یہ کہ فرشتے یہ علم نہیں جانتے بلکہ وہ اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ علم کی اس حیثیت میں جو آپ نے آدم کو عطا فرما دیا ہے ہم آدم سے کم تر ہیں۔ جس عالم میں یہ گفتگو ہو رہی ہے اس عالم کو غیب کی دنیا کے علاوہ دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا، اس لئے کہ فرشتے غیب کی دنیا کی مخلوق ہیں اور اللہ کی ذات غیب ہے۔ پس ثابت ہوا کہ آدم غیب بیں نظریں رکھتا ہے۔ اس کے اندر غیب کو دیکھنے، سمجھنے، سننے اور محسوس کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

اللہ کیوں کہ لامتناہی ہے، اس لئے اللہ کی صفات کا علم بھی لامتناہی ہے۔ یعنی آدم کو اللہ نے جو علم عطا کیا ہے وہ بھی لامتناہی ہے۔ یہ علم سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ جب آدم کی حیثیت فرشتوں سے افضل قرار پا گئی تو کائنات میں موجود تمام انواع و موجودات سے آدم افضل ہو گیا اس لئے کہ آدم کے پاس لامتناہی صفاتی علم ہے۔ اللہ کی صفات کیا ہیں؟ اللہ بحیثیت ذات خالق ہے اور اللہ کی تمام صفات بحیثیتِ خالق کائنات کے تخلیقی عناصر اور تخلیقی فارمولے ہیں۔ یہی وہ امانت ہے جو آدم کو اللہ نے اپنی رحمتِ خاص سے عطا فرمائی ہے۔

آدم اور اللہ کی گفتگو میں اگر تفکر کیا جائے تو یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ نوعِ انسانی کے علاوہ اور بھی مخلوق ہیں جن میں سے ایک کا نام فرشتہ ہے اور دوسری مخلوق کا نام جن ہے۔ ہم نہ جنات کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ فرشتوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ جنات اور فرشتوں کی دنیا سے ہم اس لئے متعارف نہیں ہیں کہ ہم اس امانت سے بے خبر ہیں جو اللہ نے اپنی رحمتِ خاص سے ہمیں عطا فرمائی ہے۔

دور بین آنکھ

یہ بات روزمرہ ہمارے مشاہدے میں آ گئی ہے کہ ہماری نظر ایک متعین حد میں کام کرتی ہے لیکن اگر نظر کی متعین حدود میں اضافہ کر دیا جائے تو نظر عام حالت میں جتنا دیکھتی ہے اس سے زیادہ فاصلے پر دیکھ سکتی ہے۔ مثلاً ہم آنکھوں پر دوربین لگا لیتے ہیں۔ دوربین کے اندر جو شیشے (LENSES) لگے ہوتے ہیں وہ ان طول موج (WAVE LENGTH) کو جو نظر کے لئے دیکھنے کا باعث بنتے ہیں آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں۔ اب ہم میلوں فاصلے کی چیز دیکھ لیتے ہیں۔ کسی آدمی کی نظر کمزور ہے۔ سامنے کی چیز اُسے نظر نہیں آتی۔ اور چشمہ لگانے کے بعد وہ دور تک دیکھنے لگتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شیشے کے اندر ایسی صلاحیت موجود ہے کہ اگر آپ اس کو صیقل کر لیں، اس کی طاقت بڑھا دیں تو نظر دور تک کام کرنے لگتی ہے۔ جب آپ شیشے کے اندر سے میلوں میل دیکھ رہے ہیں تو اس آنکھ سے، جس آنکھ نے فرشتوں کو دیکھا ہے، اور اللہ کو دیکھا ہے، غیب کی دنیا میں کیوں نہیں دیکھ سکتے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ آدم کوئی ایسی چیز ہے کہ اس کے اندر مخصوص صلاحیتیں کام کرتی ہیں اور آدم کی اولاد کوئی ایسی چیز ہے جس میں وہ صلاحیتیں کام نہیں کرتیں۔

گوشت پوست کا وجود

آدم و حوّا کی اولاد میں ہر فرد دراصل آدم و حوّا کا عکس، تمثل اور فوٹو ہے۔ جس طرح آدم کے اندر علم الاسمار سیکھنے کی صلاحیت موجود تھی، اسی طرح ہر فرد میں وہ صلاحیت اللہ کی طرف سے ودیعت ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اصل انسان رُوح ہے اور انسان کی زندگی کے سارے تقاضے رُوح سے منتقل ہوتے ہیں۔ جب تک اس جسم (گوشت پوست کے لوتھڑے) کو روح زندہ اور متحرک رکھتی ہے، گوشت پوست کے جسم میں حرکت باقی رہتی ہے اور جب رُوح اس گوشت پوست کے جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے تو گوشت پوست کے جسم میں کوئی حرکت باقی نہیں رہتی۔ یہ رُوح وہی رُوح ہے جس کو اللہ نے اپنی نیابت دی تھی۔ آدم نے جنّت میں جس وقت اللہ کے حکم سے سرتابی کی، اسی وقت رُوح کے اوپر ایک پردہ آگیا اور وہ امانت جس کی بنیاد پر وہ کائنات میں اشرف تھا پسِ پردہ چلی گئی۔ یہی پردہ جسمانی گوشت پوست ہے۔

جب تک کسی بھی آدم زاد کی دل چسپیاں اس جسم کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں، رُوحانی صلاحیتیں چھپی رہتی ہیں اور جب کسی بھی آدم زاد کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ گوشت پوست کا جسم دراصل نافرمانی کرنے کے جُرم میں ایک پردہ ہے تو اس کا ذہن حقیقت کی تلاش میں مصروف ہو جاتا ہے اور یہ تلاش اسے اس امانت سے باخبر کر دیتی ہے جس امانت کی وجہ سے کائنات کے اوپر انسان کو شرف حاصل ہے۔ کسی علم کو سیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم کسی استاد کو اپنا رہنما بنائیں۔ اور جس طرح استاد کہے بلا چوں و چرا ذہنی طور پر اس کو قبول کر لیں۔ جب کوئی شاگرد بنتا ہے تو

استاد شاگرد سے کہتا ہے پڑھو 'الف'۔ شاگرد کچھ نہیں جانتا کہ 'الف' کیا ہے وہ اپنے استاد کی نقل میں کہتا ہے 'الف' اور دھیرے دھیرے استاد کی نقالی کرتے ہوئے وہ علم سیکھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اگر بچہ پہلے قدم پر استاد سے یہ کہے کہ 'الف' کیا ہے تو علم حاصل نہیں کر سکتا اس لئے کہ جس وقت استاد شاگرد سے کہتا ہے پڑھو 'الف'، اس کی ذہنی سکت اتنی ہی ہوتی ہے کہ وہ جواباً کہے الف۔ ہم کتنے بھی پڑھ لکھ کر فاضل ہو جائیں، کتنی ہی ڈگریاں حاصل کر لیں، امانت اور رُوحانیت کے لئے ہماری پوزیشن ایک ایسے شاگرد کی ہے جو پہلی مرتبہ مکتب میں داخل ہوتا ہے۔

اللہ میاں کی جیل

آدمی جب نیابت و خلافت کی منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اس کے اُوپر آلام و مصائب کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے۔ خالق کائنات چونکہ ہر چیز سے بے نیاز اور ہر قسم کے حالات سے ماورا ہے۔ اس لئے جب کسی بندے کے اندر خالق کائنات کی صفات کروٹ بدلتی ہیں تو اس کے اوپر وہی کیفیات وارد ہوتی ہیں جو اللہ کی صفات کا تقاضا ہیں۔ آدم کو اللہ نے اپنے انعام و اکرامات سے نواز کر جنّت میں رکھا اور فرمایا اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو۔ جہاں سے دل چاہے، خوش ہو کر کھاؤ لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تمہارا شمار ایسے لوگوں میں ہو گا جو اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ آدم سے صبر نہ ہو سکا اور وہ اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ہو گیا جیسے ہی آدم نافرمانی کا مرتکب ہوا، روشنی کی جگہ تاریکی نے لے لی۔ خوشی کی جگہ غم چھا گیا۔ آزادی کی جگہ قید و بند نے اپنے پنجے گاڑ دیئے اور آدم نہایت حسرت

یاس میں جنت چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ باوجود اس کے کہ آدم نے اللہ کی نافرمانی لی اور جنت جیسی نعمت سے اس نے کفران کیا۔ اللہ نے اپنی رحیمی اور کریمی کی صفت سے پھر آدم کے اوپر فضل کیا۔ تسخیر کائنات سے متعلق اللہ نے جو خزانے عطا فرمائے تھے، آدم کو اُن سے محروم نہیں کیا اور کہا۔

"تمہارا وطن جنّت ہے۔ تم جب چاہو اپنے وطن میں واپس آسکتے ہو۔ تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ نافرمانی کے دائرے سے باہر آجاؤ۔ ہم اپنے منتخب لوگ بھیجتے رہیں گے۔ وہ تمہیں متوجہ کرتے رہیں گے کہ تم ایک عظیم خزانے کے مالک ہو ہمارے یہ پاکیزہ بندے اس راستے پر چلنے کے لئے تمہارے لئے قاعدے اور ضابطے بنائیں گے تاکہ تم آسانی کے ساتھ اپنے وطن میں داخل ہو جاؤ۔ اور یہ جو جنت کے خلاف تم اسفل سافلین کی زندگی بسر کر رہے ہو یہ تمہارے لئے جیل خانہ ہے۔ اگر تم نے اس زندگی میں اپنے اور جنّت کے درمیان پردے کو نہیں ہٹایا تو جنت تمہیں واپس نہیں ملے گی۔"

قدرت نے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کیا اور ظالم، سرکش، نافرمان نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے اور اپنی سنت قائم رکھنے کے لئے پیغمبروں کے وارث اولیاء اللہ کا سلسلہ قائم رکھا، ایسا سلسلہ جو قیامت تک جاری رہے گا۔

ہر آدمی جو ذرا بھی شعور رکھتا ہے، ہر وقت اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ مر رہا ہے۔ ایک لمحہ مرتا ہے تو دوسرا لمحہ پیدا ہوتا ہے۔ دن مرتا ہے تو رات پیدا ہوتی ہے۔ بچپن مرتا ہے تو لڑکپن پیدا ہوتا ہے۔ لڑکپن مرتا ہے

تو جوانی پیدا ہوتی ہے اور جوانی مرتی ہے تو بڑھاپا پیدا ہوتا ہے اور جب بڑھاپا مرتا ہے تو خوبصورت مورتی کا ایک ایک عضو مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو جاتا ہے:

ہڈیاں جس کے اوپر انسانی ڈھانچے کا دارومدار ہے، راکھ بن جاتی ہیں دماغ جس پر انسانی عظمت کا دارومدار ہے اور جس دماغ کے اوپر انسان اکڑتا ہے، دوسروں کے اوپر ظلم کرتا ہے، خود کو خدا کہنے لگتا ہے اس کو بھی مٹی کھا جاتی ہے اور مٹی کے ذرات کے بنے ہوئے اس جیسے دوسرے انسان اس دماغ کو اپنے پیروں تلے روندتے ہیں۔

رُوحانی بغدادی قاعدہ

کسی علم کو سیکھنے کے لئے اس کی الف ب سے واقف ہونا ضروری ہے کوئی آدمی جب تک الف ب کا قاعدہ نہیں پڑھ لیتا، پڑھنا لکھنا نہیں سیکھ سکتا۔

جس طرح ظاہری علوم سیکھنے کے لئے قاعدہ پڑھنا ضروری ہے، اسی طرح روحانی علوم سیکھنے کے لئے بھی قاعدہ پڑھنا ضروری ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ علوم ظاہری سیکھنے کے لئے الف ب پڑھنا ضروری ہے اور علومِ باطنی سیکھنے کے لئے طرزِ فکر کو تبدیل کرنا ضروری ہے۔ روحانیت سیکھنے کے لئے علومِ ظاہری کی طرح بغدادی قاعدہ اب تک نہیں چھپا۔ یہ ایک ایسا علم ہے جو قاعدوں اور ضابطوں پر تو مشتمل ہے مگر علومِ ظاہری کی طرح پڑھنے، رٹنے یا قلم سے کاغذ پر مشق کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی آسان مثال بچے کے اندر ماں کی زبان کا منتقل ہونا ہے۔ کوئی ماں مادری زبان سکھانے کے لئے بچہ کو الف ب نہیں پڑھاتی۔ لیکن بچہ وہی زبان بولتا ہے جو اس کی ماں بولتی ہے۔ بچے کے اندر از خود وہ طرزِ فکر منتقل ہوتی رہتی ہے جو بچے کے ماں باپ کی طرزِ فکر ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بکری کا بچہ گھاس کھاتا ہے، گوشت نہیں کھاتا۔ شیر کا بچہ گوشت کھاتا ہے، گھاس نہیں کھاتا۔ کبوتر کا بچہ نہ گھاس کھاتا ہے۔ نہ گوشت کھاتا ہے۔ دانہ چگتا ہے۔ آدمی کا بچہ گوشت بھی کھاتا ہے، مٹی بھی کھاتا ہے، بجری بھی کھاتا ہے،

لکڑی بھی کھاتا ہے، پتھر بھی کھاتا ہے۔ آدمی کا بچہ یہ سب چیزیں اس لئے کھاتا ہے کہ اس کے ماں باپ کی غذا میں یہ سب چیزیں شامل ہیں۔ آدمی کی طرح اگر شیر بھی یہ سب چیزیں کھاتا تو اس کے بچوں کی بھی یہی خوراک ہوتی۔ کھانا پینا، شکار کرنا اور زندگی کے دوسرے عوامل بچے کے اندر ماں باپ سے منتقل ہوتے ہیں۔ یعنی ان سب چیزوں کو سیکھنے کے لئے کسی ابتدائی کتاب یا قاعدہ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ بات بھی تفکر طلب ہے کہ ہر مخلوق زبان رکھتی ہے اور ایک دوسرے کو اپنی زبان میں جذبات و احساسات سے مطلع کرتی ہے۔ مرغی کو جب یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ اس کے بچے چیل اٹھالے جائے گی تو وہ ایک مخصوص آواز نکالتی ہے اور سارے بچے اس کے پروں میں سمٹ آتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس اس طرح ہر نوع اپنی اپنی زبان جانتی ہے اور یہ زبان اس کی نسل میں رائج ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ گفتگو کا ایک انداز اور بھی ہے جس سے ہر شخص کسی نہ کسی وقت دوچار ہوتا ہے اور ہر شخص اس اندازِ گفتگو سے واقف ہے وہ ہے اشاروں کی زبان۔ ایک باپ اپنے بچے سے کوئی بات منوانا چاہتا ہے اور آنکھوں کے ایک مخصوص انداز سے بچے کی طرف دیکھتا ہے، بچہ یہ بات سمجھ لیتا ہے۔ ماں بچے کے رونے سے یہ سمجھ جاتی ہے کہ اب بچہ بھوک سے رو رہا ہے یا وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

آپ اپنے دوستوں کے ساتھ کمرے میں بیٹھے ہیں۔ وہاں اس قسم کا ماحول ہے یا اس قسم کی گفتگو ہو رہی ہے کہ جس کے بارے میں آپ کا ذہن یہ ہے کہ بچے اس گفتگو کو نہ سنیں یا بچے کا اس ماحول میں موجود ہونا مناسب نہیں ہے۔ جیسے

ہی بچہ کمرے میں داخل ہوتا ہے آپ اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ تم یہاں نہ آؤ۔ آپ گردن ہلاتے ہیں۔ نہ بولتے ہیں اور نہ کوئی واضح اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن آپ کے دماغ میں موجود خیال سے بچّہ واقف ہوجاتا ہے۔ بچہ پوری طرح آپ کی بات سمجھ کر کمرے سے چلا جاتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کا کوئی عزیز بہت دور رہتا ہے اور وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے اور آپ پریشان ہوجاتے ہیں اور یہ ساری پریشانیاں حقیقت بن کر آپ کے سامنے آجاتی ہیں۔ کبھی یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ فلاں دوست سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ باہر نکلتے ہیں اور دوست سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم کسی حادثہ سے متعلق ایک فلم متحرک ہوجاتی ہے اس فلم کے متحرک ہونے سے دماغ پر اتنا وزن اور دباؤ پڑتا ہے کہ اعصاب ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آدمی نڈھال ہوجاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بغیر کسی وجہ اور بغیر کسی سبب کے دماغ کے اندر پھلجھڑیاں سی پھوٹنے لگتی ہیں اور آدمی خوش ہوجاتا ہے۔ بظاہر خوش ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ لیکن خوشی کے تاثر کو وہ نظر انداز نہیں کرسکتا۔

رُوح اور کمپیوٹر

ان مندرجات سے ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ انسان کے اندر کوئی کمپیوٹر نصب ہے جو اس کی زندگی کے مختلف مراحل سے گزرنے کی ہدایات دے رہا ہے۔ کبھی وہ ایسی ہدایات دیتا ہے کہ آدمی رنجیدہ ہوجاتا ہے اور کبھی ایسی اطلاع دیتا ہے کہ وہ خوش ہوجاتا

ہے۔ کبھی اسے پانی پینے کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اور کبھی کھانا کھانے کی۔ کبھی کمپیوٹر اُسے اطلاع دیتا ہے کہ اب اعصاب میں مزید عمل کرنے کی صلاحیت موجود نہیں رہی ہے، سوجاؤ۔ پھر یہ اطلاع ملتی ہے کہ اب مزید چارپائی پر لیٹے رہے اور شعوری حواس میں داخل نہ ہونے سے اعصاب مضمحل ہوجائیں گے اور آدمی اس اطلاع کو قبول کر کے بیدار ہوجاتا ہے۔ جب تک دماغ کے اندر نصب شدہ کمپیوٹر کوئی اطلاع نہیں دیتا، آدمی یا کوئی بھی ذی رُوح کوئی کام نہیں کرسکتا۔ اس میں انسان، بھیڑ، بکری، کسی جانور، نباتات یا جمادات کی کوئی قید نہیں ہے۔ سب کے اندر یہ اطلاع دینے والی مشین نصب ہے۔ یہ مشین وہی اطلاع فراہم کرتی ہے جس کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ کمپیوٹر آدمی کی رُوح ہے۔ موجودات میں جتنی ذی رُوح اور غیر ذی رُوح ہیں ان سب میں ایک ہی طرح کا کمپیوٹر نصب ہے۔ کوئی مخلوق اس کمپیوٹر کے علم سے واقف نہیں ہے۔ اللہ نے صرف انسان کو اس کمپیوٹر کا علم سکھایا ہے۔ یہی وہ علم ہے جس کو آدم اور فرشتوں کے قصّے میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔ "میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔" فرشتوں نے کہا۔ "یہ تو فساد برپا کرے گا اور ہم آپ کی تسبیح و تقدیس کے لئے کافی ہیں۔" اللہ نے فرمایا۔ "ہم جو جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔" فرشتوں کو یہ بات سمجھانے کے لئے آدم کو علم الاسمأ سکھا دیا۔ اور آدم سے کہا۔ "اس علم کو ظاہر کردو۔" اور فرشتوں سے کہا۔ "اگر تم سچے ہو تو تم اس علم کے بارے میں بتاؤ۔" فرشتوں نے عرض کیا۔ "ہم تو صرف وہی جانتے ہیں جو آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔"

آدم کی اولاد آدم ہے اور آدم کی اولاد بحیثیت آدم کے اس بات کا مشاہدہ کرتی ہے جن مشاہدات سے آدم گزرا ہے۔ اگر کوئی آدم زاد اس بات کا مشاہدہ نہ کرسکے جس حالت کا مشاہدہ آدم نے کیا یعنی خود کو فرشتوں کا مسجود دیکھنا اللہ اور فرشتوں کے درمیان مکالمہ ہونا، اللہ کا یہ کہنا کہ ہم نے آدم کو اپنی صفات کا علم سکھا دیا اور فرشتوں کا یہ کہنا کہ ہم صرف اس حد تک واقف ہیں جس حد تک آپ نے ہمیں علم عطا فرمادیا ہے، تو وہ ہرگز آدم کی اولاد کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کی حیثیت اس آدم کی نہیں ہے جس آدم کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ یہ میرا نائب اور خلیفہ ہے۔

اس گفتگو کا اجمال یہ ہوا کہ آدم زاد اگر ازل میں دی گئی نیابت سے واقف نہیں ہے اور ان واقعات کو اگر اس نے دنیاوی زندگی میں نہیں دیکھا تو وہ آدم کی باسعادت اولاد نہیں ہے۔ محض شکل وصورت کی بنا پر اس کو آدم زاد کہہ دیا جائے تو اس کو ناخلف اولاد سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اسلئے کہ اگر کوئی بندہ اللہ کے اسمار کا علم نہیں جانتا تو وہ اللہ کا نائب نہیں ہے۔
آدم زاد کو دوسری مخلوقات پر شرف اس لئے حاصل ہے کہ وہ اسمائے الٰہیہ کا علم رکھتا ہے۔

سائنس اور خرق عادات

خرقِ عادات کے سلسلے میں سائنسی نقطۂ نظر سے جو کوششیں کی جارہی ہیں ان سے ثابت ہوجاتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی کوششوں سے اور معینہ مشقوں سے اپنے اندر ماورائی صلاحیتوں کو بیدار کرلیتا ہے۔ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کے سلسلے میں یورپ اور بالخصوص روس میں جو پیش رفت ہوئی ہے، اس کے پیشِ نظر اگر صرف عبادات و ریاضات کو ماورائی علوم کے حصول کا ذریعہ سمجھ لیا جائے تو یہ بات بہت کمزور ہوجاتی ہے کیوں کہ وہ قومیں جن کا مذہب پر کوئی عقیدہ نہیں ہے، ماورائی علوم کے حصول میں قابلِ تذکرہ حد تک ترقی کرچکی ہیں۔

روحانیت میں ایک تذکرہ عام طور پر آتا ہے، تصرّف کرنا یعنی شیخ، پیرومرشد یا گرو اپنے مرید یا روحانی فرزند پر توجہ کرکے اس کے اندر کچھ روحانی تبدیلیاں پیدا کردیتا ہے۔ یہ تصرّف آج کی دنیا میں ایک سائنس داں بھی کرلیتا ہے اور وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنے حسب منشا لوگوں کو متاثر کرکے وہ کام کرنے پر مجبور کرسکتا ہے جو فی الوقت اس کے ذہن میں ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ہمارے سامنے آچکی ہے کہ سائنس دانوں نے خلا میں چہل قدمی کا دعویٰ کیا ہے۔

روحانیت میں ایک اصطلاح استعمال کی جاتی ہے "اندر دیکھنا" یعنی اندر کی آنکھ سے اس سیارے سے باہر کی دنیا کا مشاہدہ کرلینا ہے۔

آدمی کے اندر ایسی صلاحیتیں بیدار ہوجاتی ہیں، جن صلاحیتوں کی بنیاد پر وہ ایسے علوم کا اظہار کرتا ہے جو علوم کتابوں میں نہیں ملتے۔ سائنس نے اس طرف کافی پیش رفت کی ہے اور ایسے ایسے علوم کا اظہار ہو چکا ہے کہ جس کے اوپر ابتدا میں شعورِ انسانی نے یقین نہیں کیا۔ لیکن وہ چیزیں وجود میں آئیں اور انسان ان کے اوپر یقین کرنے پر مجبور ہوگیا۔ ان حالات میں روحانیت کی اصطلاحیں "توجہ، تصرّف، باطنی نگاہ کا کھلنا، زمان و مکان سے آزادی" ایک معمہ بن گئی ہیں۔ اب تک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ ماورائی نظر کا متحرک ہونا صرف ذکر و فکر اور اشغال سے ممکن ہے۔ موجودہ سائنسی دور میں یہ سمجھنا بہت ضروری ہو گیا ہے کہ جب ایسے لوگ جو مذہب پر عقیدہ نہیں رکھتے، تصرّف کر سکتے ہیں، ان کے اندر باطنی نگاہ بیدار ہو سکتی ہے، وہ نئے نئے علوم کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں، خلا میں چہل قدمی کر سکتے ہیں تو پھر یہ روحانیت کیا ہے؟

روحانیت کے ساتھ مذہب کا تذکرہ آتا ہے۔ مذہب کی بنیادیں بھی ان ہی اصولوں پر رکھی گئی ہیں کہ آدمی مذہبی فرائض پورے کرنے کے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی یا دوسروں کی زندگی میں تصرّف کر سکے۔ اس کے اندر باطنی نگاہ کے سامنے زمین سے باہر یا زمین کے اندر کی چیزیں آجائیں۔ لیکن جب ہم مذہب کے پیروکاروں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو لاکھوں کروڑوں میں ہمیں ایک آدمی بھی بمشکل ایسا ملتا ہے جس کے اندر تصرّف کی طاقت بحال ہوگئی ہو۔ جس کے اندر باطنی نگاہ کام کرتی ہو۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ مذہبی لوگ ان علوم سے بے خبر ہیں، جن علوم کی نشاندہی ایسے لوگوں نے کی ہے جو مذہب پر

عقیدہ نہیں رکھتے۔ ان حالات میں ہر سنجیدہ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ پھر مذہب کیا ہے؟

قانون

کائنات میں بے شمار نوعیں ہیں۔ ہر نوع اور نوع کا ہر فرد نوعی اور انفرادی حیثیت سے خیالات کی لہروں کے ذریعے ایک دوسرے سے مسلسل اور پیہم ربط رکھتے ہیں۔ اور یہ مسلسل اور پیہم ربط ہی افرادِ کائنات کے درمیان تعارف کا سبب ہے۔ خیالات کی یہ لہریں دراصل انفرادی اور اجتماعی اطلاعات ہیں جو ہر لمحہ اور ہر آن کائنات کے افراد کو زندگی سے قریب کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری پوری زندگی خیالات کے دوش پر سفر کر رہی ہے اور خیالات کی کارفرمائی یقین اور شک پر قائم ہے۔ یہی نقطۂ آغاز مذہب کی بنیاد ہے۔

آدمی زندگی کے مراحل وقت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں طے کرتا ہے اور زندگی بسر کرنے کے لئے ذہن میں وقت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوڑتا ہے اور ان ہی ٹکڑوں سے کام لیتا ہے۔ ہم یا تو وقت کے اس ٹکڑے سے آگے مسلسل دوسرے ٹکڑے پر آجاتے ہیں یا وقت کے اس ٹکڑے سے پلٹتے ہیں۔ اس کو اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ آدمی ابھی سوچتا ہے کہ میں کھانا کھاؤں گا۔ لیکن اس کے پیٹ میں گرانی ہے، اس لئے وہ یہ ارادہ ترک کر دیتا ہے۔ وہ کب تک اس ترک پر قائم رہے گا اس کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں۔ علیٰ ہٰذالقیاس اس کی زندگی کے اجزائے ترکیبی یہی ادوار ہیں جو اسے ناکام یا کامیاب بناتے ہیں۔ ابھی وہ ایک ارادہ کرتا ہے، پھر اسے ترک کر دیتا ہے۔ چاہے منٹوں میں ترک کرتا

ہے چاہے گھنٹوں میں، چاہے مہینوں میں، چاہے سالوں میں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ "ترک" آدمی کی زندگی کا جزو اعظم ہے۔

بہت سی باتیں ہیں جن کو دشواری، مشکل، پریشانی، بیماری، بے زاری، بے عملی، بے چینی وغیرہ وغیرہ کہتا ہے۔ اب دوسری طرف وہ ایک چیز کا نام رکھتا ہے سکون۔ یہی وہ سکون ہے جس میں وہ ہر قسم کی آسانیاں تلاش کرتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ سب حقیقتی ہیں بلکہ ان میں زیادہ تر مفروضات ہیں۔ یہی وہ چیزیں جو انسان کو آسان معلوم ہوتی ہیں اور یہی رجحان ہے جو آسانیوں کی طرف مائل کرتا ہے۔ دراصل انسان کے دماغ کی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ آسانیوں کی طرف دوڑتا ہے۔ اور ہر مشکل سے بھاگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دو سمتیں ہیں اور ان سمتوں میں آدمی افکار کے ذریعے زندگی گزارتا ہے۔ اس کی ہر حرکت کا منبع ان دو سمتوں میں سے ایک سمت ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ابھی ہم نے ایک تدبیر کی۔ اس وقت جب ہم اس تدبیر کی تنظیم کر رہے تھے وہ ہر طرح مکمل تھی اور اس کی سمت بھی صحیح تھی لیکن صرف چند قدم چلنے کے بعد ہمارے ذہن میں تبدیلی ہوئی۔ تبدیلی ہوتے ہی افکار کا رُخ بدل گیا۔ نتیجہ میں سمت بھی تبدیل ہو گئی۔ اب ہم جس منزل کی طرف رواں دواں تھے وہ منزل غیب میں چلی گئی اور ہمارے پاس باقی کیا رہا؟ — ٹٹولنا اور ٹٹول کر قدم اٹھانا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کروڑ آدمیوں میں صرف ایک آدمی ایک قدم اٹھاتا ہے جو صحیح سمت میں اٹھتا ہے اور پیچھے نہیں ہٹتا۔ واضح رہے کہ یہ تذکرہ یقین اور شک کی درمیانی راہوں کا ہے۔ اب رہی اکثریت کی بات تو اس کے دماغ کا محور وہم اور شک پر ہے۔ یہی وہ وہم اور شک ہے جو اس کے دماغ کے خلیوں میں ہمہ وقت عمل

کرتا رہتا ہے۔ جس قدر اس میں شک کی زیادتی ہوگی اسی قدر دماغی خلیوں (CELLS) میں ٹوٹ پھوٹ واقع ہوگی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہی وہ دماغی خلیے ہیں جن کے زیرِ اثر تمام اعصاب کام کرتے ہیں اور اعصاب کی تحریکات ہی زندگی ہیں۔ کسی چیز پر انسان کا یقین کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا فریب کو جھٹلانا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انسان جو کچھ ہے خود کو اس کے خلاف پیش کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی کمزوریوں کو چھپاتا ہے اور ان کی جگہ مفروضہ خوبیاں بیان کرتا ہے جو اس کے اندر موجود نہیں ہیں۔

معاشرہ اور عقیدہ

آدمی جس معاشرے میں تربیت پاکر جوان ہوتا ہے وہ معاشرہ اس کا عقیدہ بن جاتا ہے۔ اس کا ذہن اس قابل نہیں رہتا کہ اس عقیدے کا تجزیہ کرسکے۔ چنانچہ وہ عقیدہ یقین کا مقام حاصل کرلیتا ہے حالاں کہ وہ محض فریب ہے۔ اس کی بڑی وجہ ہم بتا چکے ہیں کہ آدمی جو کچھ خود کو ظاہر کرتا ہے حقیقتاً وہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہے۔

اس قسم کی زندگی گزارنے میں اسے بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں۔ ایسی مشکلات جن کا حل اس کے پاس نہیں ہے۔ اب قدم قدم پر اُسے خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا عمل تلف ہو جائے گا اور بے نتیجہ ثابت ہوگا۔ بعض اوقات یہ شک یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی زندگی تلف ہو رہی ہے اور اگر تلف نہیں ہو رہی تو سخت خطرے میں ہے۔ اور یہ سب کچھ ان دماغی خلیوں کی وجہ سے ہے جن میں تیزی سے ٹوٹ پھوٹ واقع ہو رہی ہے۔

جب آدمی کی زندگی وہ نہیں ہے جسے وہ گزار رہا ہے یا جسے وہ پیش کر رہا ہے تو جس پر اس کا عمل ہے، وہ اس عمل سے وہ نتائج برآمد کرنا چاہتا ہے جو اس کے حسب خواہ

ہوں لیکن دماغی خلیوں کی تیزی سے ٹوٹ پھوٹ اور ردوبدل قدم قدم پر اس کے عملی راستوں کو بدلتی رہتی ہے۔ اور وہ یا تو بے نتیجہ ثابت ہوتے ہیں یا ان سے نقصان پہنچتا ہے یا ایسا شک پیدا ہوتا ہے جو قدم اٹھانے میں رکاوٹ بنتا ہے۔

آدمی کے دماغ کی ساخت دراصل اس کے اختیار میں ہے۔ ساخت سے مراد دماغی خلیوں میں تیزی سے ٹوٹ پھوٹ، اعتدال میں ٹوٹ پھوٹ یا کم ٹوٹ پھوٹ ہوتا ہے۔ یہ محض اتفاقیہ امر ہے کہ دماغی خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کم سے کم ہو جس کی وجہ سے وہ شک سے محفوظ رہتا ہے لیکن جس قدر شک اور بے یقینی دماغ میں کم ہوگی اسی قدر آدمی کی زندگی کامیاب گزرے گی اور جس مناسبت سے شک اور بے یقینی کی زیادتی ہوگی، زندگی ناکامیوں میں بسر ہوگی۔

دماغی خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ

آدمی کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس نے اللہ کے عطا کئے ہوئے علوم کو خود ساختہ اور غلط بنیادوں پر پرکھا اور ان سے انکاری ہوگیا۔ اللہ نے ہر علم کی بنیاد روشنی کو قرار دیا ہے۔ آدمی کو چاہئے یہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ روشنیوں کی قسمیں اور روشنیوں کا طرزِ عمل معلوم کرتا لیکن اس نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی اور یہ چیز ہمیشہ پردے میں رہی۔ آدمی نے اس پردے میں جھانکنے کی کوشش اس لئے نہیں کی کہ یا تو اس کے سامنے روشنیوں کا کوئی پردہ موجود ہی نہیں تھا یا اس نے روشنیوں کے پردے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی۔ وہ یہ قاعدے معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوا جو روشنیوں کے خلط ملط سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر آدمی یہ طرزِ عمل اختیار کرتا تو اس کے دماغی خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کم سے کم ہوسکتی

تھی۔ اس حالت میں وہ زیادہ سے زیادہ یقین کی طرف قدم اٹھاتا اور شکوک اسے اتنا پریشان نہ کرتے جتنا کہ اب اسے پریشان کئے ہوئے ہیں۔ اس کی تحریکات میں جو عملی رکاوٹیں واقع ہوئی ہیں وہ کم سے کم ہوتیں لیکن ایسا نہیں ہوا اس نے روشنیوں کی قسمیں معلوم نہیں کیں، نہ روشنیوں کی طبیعت کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ روشنیاں بھی طبیعت اور ماہیت رکھتی ہیں اور روشنیوں میں رجحانات بھی موجود ہیں۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ روشنیاں ہی اس کی زندگی ہیں اور اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ وہ صرف مٹی کے پتلے سے واقف ہے۔ اس پتلے سے جس کے اندر اس کی اپنی کوئی زندگی موجود نہیں ہے۔ جس کو اللہ نے سڑی ہوئی مٹی سے بنایا ہے۔ اس کے اندر اپنی ذاتی کوئی حقیقت موجود نہیں ہے۔ حقیقت جو اللہ نے رُوح کی شکل میں پھونکی ہے۔

روشنیوں کے عمل سے ناواقفیت اللہ کے اس بیان سے منحرف کرتی ہے۔ جہاں تک انحراف واقع ہوتا ہے وہاں تک وہم اور شک بڑھتا ہے، ایمان اور یقین ٹوٹ جاتے ہیں۔

ماہرِ روحانیت یقین کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

"یقین وہ عقیدہ ہے جس میں شک نہ ہو۔"

ارادہ یا یقین کی کمزوری دراصل شک کی وجہ سے جنم لیتی ہے۔ جب تک خیالات میں تذبذب رہے گا، یقین میں کبھی بھی پختگی نہیں آئے گی۔ مظاہر اپنے وجود کے لئے یقین کے پابند ہیں۔ کیوں کہ کوئی خیال یقین کی روشنیاں حاصل کرکے مظہر بنتا ہے۔

مذہب

مذہب ہمیں یقین کے اس پیٹرن (PATTERN) میں داخل کر دیتا ہے جہاں شک و شبہات اور وسوسے ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنی باطنی نگاہ سے غیب کی دنیا اور غیب کی دنیا میں موجود چلتے پھرتے فرشتوں کو دیکھ لیتا ہے۔ غیب کی دنیا کے مشاہدات سے بندے کا اپنے رب کے ساتھ ایک ایسا تعلق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خالق کی صفات کو اپنے اوپر محیط دیکھتا ہے۔ روحانی نقطۂ نگاہ سے اگر کسی بندے کے اندر باطنی نگاہ متحرک نہیں ہوتی تو ایمان کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا۔ جب کوئی بندہ ایمان کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کی طرز فکر میں سے تخریب اور شیطنت نکل جاتی ہے۔ اور اگر بندے کے اوپر یقین (غیب کی دنیا) منکشف نہیں ہے تو ایسا بندہ ہر وقت تخریب اور شیطنت کے جال میں گرفتار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بے شمار ایجادات اور لامتناہی آرام و آسائش کے باوجود ہر شخص بے سکون پریشان اور عدم تحفظ کا شکار ہے۔ سائنس چوں کہ میٹر (MATTER) پر یقین رکھتی ہے اور میٹر عارضی اور فکشن (FICTION) ہے، اس لئے سائنس کی ہر ترقی، ہر ایجاد اور آرام و آسائش کے تمام وسائل عارضی اور فنا ہو جانے والے ہیں۔ جس شے کی بنیاد ہی ٹوٹ پھوٹ اور فنا ہو، اس سے کبھی حقیقی مسرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ مذہب اور لامذہب میں یہ بنیادی فرق ہے کہ لامذہبیت انسان کے اندر شکوک و شبہات، وسوسے اور غیر یقینی احساسات کو جنم دیتی ہے۔ جب کہ مذہب تمام احساسات، خیالات، تصورات اور زندگی کے اعمال و حرکات کو ایک قائم بالذات اور مستقل ہستی سے وابستہ کر دیتا ہے۔

سائنسی نظریہ

سائنس داں جس مادی نظریے کی تشہیر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کا عملی مظاہرہ (DEMONSTRATION) نہ ہو اُسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس داں بہت کچھ جاننے کے باوجود یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ مادی خول میں بند ہو کر خود اپنے نظریے کی نفی کر رہے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسا غیب جو آنکھ سے نظر نہ آئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا جب کہ ان کی ساری ترقی کا دارومدار نظر نہ آنے والی روشنی پر ہے۔

بانیِ قلندر شعور، ابدال حق، حسن اخریٰ محمد عظیم برخیا قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

روحانی اقدار سے متعلق جتنے علوم ابھی تک زیر بحث آئے ہیں ان سب علوم میں کائنات جو مظاہر میں اہمیت رکھتی ہے وہ بعد کی چیز ہے، پہلے مخفی اور غیب کو زیر غور لایا جاتا ہے اور مخفی اور غیب ہی کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر مخفی اور غیب سمجھنے میں آسانی ہو جائے تو مظاہر کس طرح بنتے ہیں، مظاہر کے بننے اور تخلیق ہونے کے قوانین کیا ہیں یہ ساری باتیں آہستہ آہستہ ذہن میں آنے لگتی ہیں۔ اور فکر اس کو اسی طرح محسوس کرتی ہے جس طرح بہت سی باتیں جو انسان کے تجربے میں نوعمری سے ہوش کے زمانے تک آتی رہتی ہیں ان میں ایک خاص طرح کا ارتباط رہتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو جو غیب سے متعلق ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بہت سے نام دیئے ہیں اور انبیاء نے ان ناموں کا تذکرہ کر کے ان کے اوصاف کو عوام کے سامنے پیش کیا ہے قرآن پاک سے پہلے کی کتابیں بھی ان چیزوں پر روشنی ڈالتی ہیں لیکن ان کتابوں میں جستہ جستہ تذکرے ہیں۔ زیادہ تفصیلات قرآن پاک میں ملتی ہیں۔ قرآن پاک کی

تفصیلات پر جب غور کیا جاتا ہے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غیب مظاہر سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ غیب کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ مذہب یا دین جس چیز کو کہتے ہیں وہ غیب ہی کے BASE پر منحصر ہے۔ مظاہر کا تذکرہ مذہب میں ضرور آتا ہے لیکن یہ ثانویت رکھتا ہے۔ اس کو کسی دَور میں اوّلیت حاصل نہیں تھی۔ مادّی دنیا اسے کتنی ہی اوّلیت دے۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ بھی اس ہی طرز پر سوچنے لگی ہے۔ مثلاً موجودہ دَور کے سائنس داں بھی غیب کو اوّلیت دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وہ کسی چیز کو فرض کرتے ہیں۔ فرض کرنے کے بعد پھر نتائج اخذ کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں اور جب نتائج اخذ کرتے ہیں تو وہ ان تمام چیزوں کو حقیقی، لازمی اور یقینی قرار دیتے ہیں جیسا کہ بیسویں صدی میں الیکٹران کا کردار زیر بحث ہے۔ الیکٹران کے بارے میں سائنس والوں کی ایک ہی رائے ہے کہ وہ بیک وقت AS A PARTICLE اور BEHAVE (AS A WAVE کرتا ہے۔ اب غور طلب یہ ہے کہ جو چیز محض مفروضہ ہے وہ بیک وقت دو طرز پر عمل کرے اور اس کے عمل کو یقینی تسلیم کیا جائے۔ وہ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ الیکٹران کو نہ آج تک دیکھا گیا ہے اور نہ آئندہ اس کو دیکھنے کی امید ہے لیکن ساتھ ہی وہ الیکٹران کو اتنی ٹھوس حقیقت تسلیم کرتے ہیں جتنی ٹھوس کوئی حقیقت اب تک نوعِ انسانی کے ذہن میں آسکی ہے یا نوعِ انسانی جس حقیقت سے اب تک روشناس ہو سکی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ صرف مفروضہ ان کے ذہن میں ہے اور مفروضہ سے چل کر وہ اس نتیجے پر ایسی منزل تک پہنچ جاتے ہیں جس منزل کو اپنے لئے ایجادات اور بہت زیادہ اہمیت کی اور کامیابی کی منزل قرار دیتے ہیں۔ اس اہم منزل کو وہ نوعِ انسانی کے عوام سے روشناس کرنے

کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ جن حقائق کو وہ ایک مرتبہ حقائق کہہ کر پیش کر چکے ہیں چند سال کے بعد یا زیادہ مدت کے بعد وہ ان حقائق کو رد کر دیتے ہیں۔ اور رَد کر کے ان کی جگہ نئے طور اطوار، نئے فارمولے لے آتے ہیں۔ اور ان نئے فارمولوں کو پھر ان ہی حقائق کا مرتبہ دیتے ہیں جن حقائق کا مرتبہ پہلے وہ ایک حد تک برسہا برس کسی بھی ایک رد شدہ چیز کو دے چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ غیب کی دنیا اُن کے لئے اوّلیت رکھتی ہے حالاں کہ وہ محض مادّہ پرست ہیں اور خود کو مادّیت کی دنیا کا پرستار کہتے ہیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی ذات یا غیب کی دنیا کوئی چیز ہے یا کوئی اوّلیت رکھتی ہے یا اس کے کوئی معنی ہیں یا قابلِ تسلیم ہے یا اس کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس قسم کے تصوّرات جن کو مادّیت کہنا چاہیئے ان کے اردگرد ہمیشہ جمع رہتے ہیں اور جب کبھی کسی غیب کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ ایک ہی مطالبہ کرتے ہیں کہ جب تک کوئی DEMONSTRATION نہ کیا جائے اس وقت تک ہم کسی غیب سے متعارف ہو سکتے ہیں، نہ کسی غیب سے متعلق یقین کرنے کو اور یہ سمجھنے کو کہ غیب کوئی چیز ہو سکتا ہے ہم تیار ہیں یا یہ کہ ہم سائنس کی دنیا میں نظریۂ غیب کو یا غیب کے تذکرے کو کوئی جگہ دینے کے لئے آمادہ ہیں۔ بہرکیف وہ جس طرح بھی کہتے ہیں یہ تو صرف طرزِ فکر ہے اور طرزِ گفتگو ہے لیکن عملی دنیا میں اور تفکر کی عملی منزل میں وہ اسی مقام پر ہیں جس مقام پر کہ ایک آدمی غیب پر یقین کرنے والا اللہ کی ذات کو پیش کرتا ہے اور ان تمام ایجنسیوں کو تسلیم کرتا ہے جن کا تذکرہ اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں کیا ہے اور وہ ایجنسیاں جو شرطِ ایمان ہیں اور کسی ایسے شخص پر جو اللہ کو مانتا ہے اپنا تسلّط رکھتی ہیں اور ان تمام ایجنسیوں اور ان تمام

ہستیوں کو وہ ایسی زندہ حقیقت اور ایسی ٹھوس معنویت تسلیم کرتا ہے جیسے کہ مادہ پرست کسی پتھر کی یا معدنی یا کسی ایسے مظاہر کے متعلق چیز کو تسلیم کرتے ہیں جو ان کے سامنے بطور مشاہدے کے ہمہ وقت موجود رہتی ہے اور جس کو یہ چھوتے، چکھتے، دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ جس کے متعلق وہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں تغیّر ہے، اس میں توازن ہے، اس میں ایک امتزاج ہے، اس میں تاثر ہے، اس میں قوّت ہے اور جس قسم کی چیز وہ مادیت کی دنیا میں دیکھتے ہیں ان تمام چیزوں کا وہ اسی طرح تذکرہ کرتے ہیں اور ان پر ایک خاص طرز سے ایمان رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک خدا کا پرستار جس طرح غیب پر ایمان رکھتا ہے بالکل اسی طرح مادّے کا پرستار مادّیت کی دنیا پر یقین رکھتا ہے۔ نہ خدا پرست کو غیب کی دنیا پر ایمان رکھے بغیر چارہ ہے اور نہ مادّیت پرست کو مادّہ پر ایمان لائے بغیر مفر ہے۔ دونوں ایک نہ ایک طرز رکھتے ہیں اور ان میں یہ چیز مشترک ہے کہ اس طرز پر ان کا ایمان اور ایقان ہوتا ہے۔ اسی ایمان و ایقان کو یہ زندگی کہتے ہیں۔ اصل میں کہنے کی بات یہ ہے کہ کوئی زندگی بغیر ایمان و ایقان کے ناممکن ہے خواہ کسی خدا پرست کی زندگی ہو یا مادّہ پرست کی۔

تخلیقی فارمولے

ہم جب اللہ کی تخلیق پر غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ باوجود اس کے کہ میٹر (MATTER) ایک ہے، تخلیقی قاعدے، ضابطے اور طریقے ایک ہیں، مخلوق کے اندر طبعی تقاضے یکساں ہیں، عقل و شعور سب میں ہے، یہ الگ بات ہے کہ کسی میں شعور زیادہ ہے، کسی میں کم ہے، کسی میں بہت کم ہے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر تخلیق کی انفرادیت اپنی جگہ قائم ہے۔ انفرادیت کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ اجتماعی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا رُخ الگ اور منفرد شخصیت کے روپ میں موجود ہے۔ اجتماعی رُخ کو ہم "نوع" کا نام دیتے ہیں اور انفرادی رُخ کو ہم "فرد" کہتے ہیں۔ ہر نوع کا ہر فرد الگ ایک حیثیت، شکل و صورت، رنگ و روپ اور نقش و نگار رکھتا ہے۔ طوطے کی نوع کے تمام افراد کی شکل ایک ہے۔ کبوتر کی نوع کے افراد کی شکل و صورت ایک ہے۔ اسی طرح اللہ کی جتنی بھی مختلف مخلوقات ہیں وہ نوعی اعتبار سے جو شکل و صورت رکھتی ہیں وہی شکل و صورت انفرادی ہے۔ یہ بات ایسی ہے کہ اس میں زیادہ تفکر اور تدبّر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انسانی مشاہدات ہر وقت اس صورتِ حال سے آشنا ہیں۔

نوعی تنوع پر غور ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ نوع کا مختلف ہونا اس بات کی علامت ہے کہ نوع کے خد و خال میں معین مقداریں کام کر رہی ہیں۔ بکری کی نوع

میں اللہ نے جو معین مقداریں رکھ دی ہیں وہ جب متحرک ہوتی ہیں تو اس کے نتیجے میں بکری کی تخلیق ہوتی ہے ۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بکری کے پیٹ سے کبوتر پیدا ہو جائے ۔ یہ معین مقداریں نہ صرف زمین کے اوپر موجود مخلوق میں نظر آتی ہیں بلکہ کائنات کی ہر تخلیق کے ہر جزو میں یہ مقداریں کام کر رہی ہیں۔ ان مقداروں کا اہم کام یہ ہے کہ جب آپس میں ردو بدل ہوتی ہیں یا ان کا آپس میں ایک دوسرے کے اندر انجذاب ہوتا ہے تو مختلف رنگ اختیار کر لیتی ہیں اور یہ رنگ ہی دراصل کسی نوع کے خدوخال بن جاتے ہیں۔

قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے تخلیقی فارمولوں کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"کائنات میں موجود تمام مادّی اجسام لاشمار رنگوں میں سے متعدد رنگوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ یہ رنگ نسمہ کی مخصوص حرکات سے وجود میں آتے ہیں۔ نسمہ (AURA) کی معین طوالتِ حرکت سے ایک رنگ بنتا ہے۔ دوسری طوالتِ حرکت سے دوسرا رنگ ۔ اس طرح نسمہ کی لاشمار طوالتوں سے لاشمار رنگ وجود میں آتے رہتے ہیں ان رنگوں کا عددی مجموعہ ہر نوع کے لئے الگ الگ معین ہے۔ اگر گلاب کے لئے رنگوں کا عددی مجموعہ "الف" معین ہے تو 'الف' عددی مجموعہ سے ہمیشہ گلاب ہی وجود میں آئے گا۔ کوئی اور شے وجود میں نہیں آئے گی۔ اگر آدمی کی تخلیق رنگوں کی 'جیم' تعداد سے ہوتی ہے تو اس مقدار سے دوسرا حیوان نہیں بن سکتا، صرف نوعِ انسانی ہی کے افراد وجود میں آسکتے ہیں۔

عالمِ رنگ میں جتنی اشیاء پائی جاتی ہیں وہ سب رنگین روشنیوں کا مجموعہ ہیں

ان ہی رنگوں کے ہجوم سے وہ شے وجود میں آتی ہے جس کو عرفِ عام میں "مادہ" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ سمجھا جاتا ہے کہ مادہ کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے، اگر اس کو شکست و ریخت کر کے انتہائی مقداروں تک منتشر کر دیا جائے تو محض رنگوں کی جداگانہ شعاعیں باقی رہ جائیں گی۔ اگر بہت سے رنگ لے کر پانی میں تحلیل کر دیئے جائیں تو ایک خاکی مرکب بن جائے گا جس کو ہم مٹی کہتے ہیں۔ گھاس، پودوں اور درختوں کی جڑیں پانی کی مدد سے مٹی کے ذرات کی شکست و ریخت کر کے ان ہی رنگوں میں سے اپنی نوع کے رنگ حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ تمام رنگ پتّی اور پھول میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ تمام مخلوقات اور موجودات کی مظہری زندگی اس ہی کیمیائی عمل پر قائم ہے۔"

رنگوں کی تعداد گیارہ ہزار ہے

میٹر ایک ہے۔ ڈائیاں مختلف ہیں تخلیق اس طرح عمل میں آتی ہے کہ ڈائی میٹر کو اپنے اندر محفوظ کر کے اس طرح متحرک کرتی ہے کہ میٹر مختلف اور معین مقداروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب یہ معین مقداریں ایک دوسرے میں مل کر جذب ہوتی ہیں تو کوئی ایک رنگ بنتا ہے اور جب ایک رنگ دوسرے رنگ میں جذب ہوتا ہے تو تیسرا رنگ بنتا ہے۔ نتیجے میں بے شمار رنگ وجود میں آتے ہیں۔ اور یہ بے شمار رنگ ہی اللہ کی کائنات ہیں۔

آدمی کے اندر بجلی کا بہاؤ

بحیثیت مجموعی کائنات میں جو رنگ قلندر شعور سے نظر آتے ہیں ان کی تعداد تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار ہے جب کہ سائنسداں اب تک تقریباً ساٹھ سے زیادہ رنگ دریافت کر سکے ہیں اور عام حالات میں جب رنگوں کا تذکرہ آتا ہے تو ان کی تعداد

سات بتائی جاتی ہے۔ فی الواقع کتنے رنگ ہیں اس کا پورا علم اللہ کو ہے لیکن قلندر شعور سے یہ بات مشاہدے میں آجاتی ہے کہ کائناتی افراد کی بنیاد رنگ ہیں اور یہ رنگ جب بہاؤ (FLOW) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو اس میں ایک کرنٹ پیدا ہوتا ہے۔ یہ کرنٹ (ELECTRICITY) ہی زندگی بنتا ہے۔ آدمی سنکھیا کھا کر اس لئے مر جاتا ہے کہ سنکھیا کے اندر رنگ کے بہاؤ یعنی الیکٹرسٹی کا وولٹیج (VOLTAGE) آدمی کے اندر کام کرنے والے وولٹیج سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ساٹھ واٹ بجلی کے بلب میں کئی ہزار واٹ بجلی دوڑا دی جائے تو بلب فیوز ہو جاتا ہے۔

ہم جب کرنٹ کو چھوتے ہیں تو شاک (SHOCK) لگتا ہے۔ شاک لگنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے اندر دوڑنے والی بجلی میں ایک ہلچل پیدا ہو جاتی ہے اور اس ہلچل یا تلاطم کو آدمی کی پوری باڈی (BODY) محسوس کرتی ہے اور اگر آدمی کے اندر کام کرنے والی بجلی کا وولٹیج کمزور ہے یا مقدار سے کم ہے تو آدمی گر بھی جاتا ہے اور بے ہوش بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آدمی ایسا طریقہ اختیار کرے جس طریقے میں بجلی کا بہاؤ براہِ راست ارتھ نہیں ہوتا تو اسے شاک یا جھٹکا نہیں لگتا۔ اس بات سے مسئلہ منکشف ہوا کہ کائناتی تخلیق میں نگیٹو یا پازیٹو (NEGATIVE & POSITIVE) اصول کے تحت ایسی نوع بھی موجود ہے جو بجلی کے بہاؤ کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اس کلیہ (EQUATION) سے انکشاف ہوتا ہے کہ ایک، دو، دس، بیس تخلیقی عوامل ایسے بھی ہیں کہ جو اپنے اندر الیکٹرسٹی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

قلندر شعور ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ہم کائناتی تخلیقی فارمولوں کے تحت اپنے اندر ہر قسم کی غیر مرئی (INVISIBLE) صلاحیتوں کو اپنے ارادے اور اختیار سے متحرک کر سکتے ہیں۔ ایک آدمی جب اپنے اندر دَور کرنے والی بجلی یا نسمہ (AURA) سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ بجلی کے بہاؤ کو روک بھی سکتا ہے اور اپنے اندر زیادہ سے زیادہ وولٹیج کا ذخیرہ بھی کر سکتا ہے اور اس ذخیرہ سے ماورائی دنیا میں بغیر کسی وسیلے کے پرواز بھی کر سکتا ہے۔ الیکٹرسٹی کے ذخیرے کے بعد اس کے اندر ایسی سکت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے آسمان اور زمین کے کناروں سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی زمین کی طرح کہکشاں میں بے شمار زمینیں آجاتی ہیں۔ جس طرح وہ اپنی زمین پر آباد اللہ کی مخلوق کو دیکھتا ہے اسی طرح کھربوں دنیاؤں کا بھی مشاہدہ کرتا ہے۔

قلندر شعور جب بیدار ہوتا ہے تو وہ یہ دیکھ لیتا ہے، جان لیتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ اس دنیا کی طرح اور بھی بے شمار دنیائیں موجود ہیں اور ہر دنیا ہماری دنیا جیسی ہے۔ جس طرح ہماری دنیا پر آدمی آباد ہیں اسی طرح دوسری دنیاؤں میں بھی آدمی بستے اور رہتے ہیں۔ جس طرح اس دنیا میں افزائشِ نسل کا سلسلہ جاری ہے اسی طرح دوسری دنیاؤں میں بھی شادیاں ہوتی ہیں اور اولادیں پیدا ہوتی ہیں۔ غرضیکہ اس دنیا میں اور اس دنیا سے باہر بے شمار دنیاؤں میں بھی خورد و نوش، رہن سہن، کھیتی باڑی، کاروبار اور مرنا جینا سب موجود ہے۔

وقت کی نفی

کسی آدمی کے اندر پرواز کی صلاحیتوں کا انحصار بجلی کے ذخیرے کے اوپر ہے۔ جتنا زیادہ ذخیرہ موجود ہوتا ہے اسی مناسبت سے

آدمی ٹائم اسپیس کی نفی کرنے پر قدرت حاصل کرلیتا ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں کہ ایک منٹ کے وقفے میں آدم زاد نے بغیر کسی مادی وسائل کے کئی سال کا سفر طے کرلیا۔

غوث علی شاہ قلندرؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص شاہ عبدالعزیز رح کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لباس کے اعتبار سے وہ شاہی عہدے دار معلوم ہوتا تھا۔ شاہ صاحبؒ سے کہنے لگا کہ حضرت میری سرگزشت اتنی عجیب و غریب ہے کہ کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ اس معاملے میں میری عقل بھی کام نہیں کرتی۔ حیران ہوں کہ کیا کہوں، کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ جو حکم فرمائیں بجا لاؤں گا۔

اس شخص نے اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہا:

'میں لکھنؤ میں رہتا تھا۔ برسرِ روزگار تھا اور حالات اچھے گزر رہے تھے کہ قسمت نے پلٹا کھایا۔ معاشی حالات خراب ہوتے گئے اور زیادہ وقت بے کاری میں گزرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ بیرونِ شہر حصولِ معاش کی کوشش کی جائے۔ تھوڑا سا زادِ راہ ساتھ لیا اور اودے پور کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں ریواڑی کے مقام پر قیام کیا۔ اس زمانے میں وہ جگہ ویران پڑی تھی۔ صرف ایک سرائے آباد تھی۔ سرائے میں کچھ کسبیاں رہتی تھیں۔ میں سرائے میں متفکر بیٹھا تھا کہ کیا کیا جائے۔ پیسے بھی ختم ہوگئے تھے۔ ایک کسبی آئی اور کہنے لگی کہ صاحب! کھانا تیار ہے، کھانا لاؤں؟ میں نے کہا، ابھی سفر کی تھکان ہے۔ ذرا سستا لوں۔ تھکن دور ہونے پر کھانا کھاؤں گا۔ یہ سُن کر وہ چلی گئی۔ وہ کچھ دیر بعد آئی اور وہی سوال کیا۔ میں نے پھر وہی جواب دیا اور وہ چلی گئی۔ تیسری مرتبہ آکر پوچھا

تو میں نے سب کچھ بتا دیا کہ میرے پاس جو کچھ تھا وہ خرچ ہوگیا۔ اب ہتھیار اور گھوڑا بیچنے کی نوبت آگئی ہے۔ وہ خاموش ہو کر چلی گئی۔ پھر دس روپے لا کر مجھے دیئے اور کہا کہ یہ روپے میں نے چرخہ کات کر اپنے کفن دفن کے لئے جمع کئے ہیں۔ یہ میں آپ کو بطور قرض حسنہ دیتی ہوں۔ جب اللہ آپ کو دے تو ادا کر دیجئے گا۔

میں نے روپے لے لئے اور راستے میں خرچ کرتا ہوا اودے پور جا پہنچا وہاں اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ فوراً ایک شاہی نوکری مجھے مل گئی۔ مالی اعتبار سے خوب ترقی ہوئی اور چند سالوں میں دولت کی ریل پیل ہوگئی۔ ان ہی دنوں گھر سے خط آیا کہ لڑکا جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکا ہے اور جہاں اس کی نسبت ٹھہرائی گئی ہے وہ لوگ شادی پر اصرار کر رہے ہیں۔ اس لئے جلد سے جلد آکر اس فرض سے سبک دوش ہو جاؤ۔

راجہ سے اجازت لے کر میں اپنے گھر کے لئے روانہ ہوا۔ راستے میں ریواڑی کا مقام آیا۔ پرانے واقعات ذہن میں تازہ ہوگئے۔ سرائے جا کر کسبی کے متعلق معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ سخت بیمار ہے اور چند لمحوں کی مہمان ہے۔ جب میں کسبی کے پاس پہنچا تو وہ آخری سانسیں لے رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روح پرواز کرگئی۔ میں نے تجہیز و تکفین کی اور اپنے ہاتھ سے قبر میں اتارا۔ اس کام سے فارغ ہو کر سرائے میں آکر سوگیا۔ آدھی رات کے وقت پیسوں کا خیال آیا۔ دیکھا تو جیب میں رکھی ہوئی پانچ ہزار کی ہنڈی غائب تھی۔ تلاش کیا مگر نہ ملی۔ سوچا کہ دفن کرتے وقت شاید قبر میں گر گئی ہوگی۔ اس خیال سے قبرستان پہنچا اور قبر کھودنے لگا۔ قبر کے اندر اُترا تو ایک عجیب و غریب صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں نہ میت تھی نہ ہنڈی

ایک طرف دروازہ نظر آرہا تھا۔ ہمت کرکے دروازے کے اندر قدم رکھا تو ایک نئی دنیا سامنے تھی۔ چاروں طرف باغات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اور ہرے بھرے پھل دار درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ باغ میں ایک طرف ایک عالی شان عمارت بنی ہوئی تھی۔ عمارت کے اندر قدم رکھا تو ایک حسین و جمیل عورت پر نظر پڑی جو شاہانہ لباس پہنے، بناؤ سنگھار کئے بیٹھی تھی اور ارد گرد خدمتگار ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ عورت نے مجھے مخاطب کرکے کہا کہ تم نے مجھے پہچانا؟ میں وہی ہوں جس نے تمہیں دس روپے دیئے تھے۔ اللہ کو میرا یہ عمل پسند آیا اور اس عمل کی بدولت مجھے یہ مرتبہ اور عروج عنایت فرمایا ہے۔ اور یہ تمہاری ہنڈی ہے جو قبر میں گر گئی تھی۔ یہ لو اور فوراً چلے جاؤ۔

میں نے اس سے کہا میں یہاں کچھ دیر ٹھہر کر سیر کرنا چاہتا ہوں۔ عورت نے جواب دیا۔ تم قیامت تک یہاں کی سیر نہیں کر سکتے۔ فوراً چلے جاؤ۔ اس عرصے میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہوگی۔ عورت کی ہدایت پر میں نے عمل کیا۔ باہر نکلا تو عجیب عالم تھا۔ نہ وہاں سرائے تھی اور نہ ہی وہ لوگ تھے جو اس کے قبر کے اندر جاتے وقت موجود تھے بلکہ چاروں طرف شہری آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں سے سرائے کے بارے میں پوچھا لیکن سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ بعض لوگوں سے اپنی روئیداد بیان کی لیکن سب نے مجھے مخبوط الحواس قرار دیا۔ آخر کار مجھے ایک آدمی نے کہا کہ میں تمہیں ایک بزرگ کے پاس لے چلتا ہوں۔ وہ عمر رسیدہ ہیں۔ شاید وہ کچھ بتا سکیں۔ اس بزرگ نے سارا حال سنا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا کہ مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ میرے پردادا بتایا کرتے تھے کہ کسی زمانے میں یہاں ایک سرائے موجود

تھی۔ سرائے میں ایک امیر آکر ٹھہرا تھا اور ایک رات پُراسرار طریقے سے غائب ہو گیا پھر اس کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا۔ میں نے کہا میں وہی امیر ہوں جو سرائے سے غائب ہوا تھا۔ یہ سن کر وہ بزرگ اور حاضرینِ محفل بہت حیران ہوئے۔

اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔ پھر شاہ عبدالعزیزؒ سے کہنے لگا اب بتایئے میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔ نہ گھر ہے نہ ٹھکانہ۔ دوسرے یہ کہ اس حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین واقعے نے میرے ذہن کو مفلوج کرکے رکھ دیا ہے۔ شاہ صاحب نے کہا، تم نے جو کچھ بتایا ہے وہ صحیح ہے۔ اِس عالم اور اُس عالم کے وقت کے پیمانے الگ الگ ہیں۔

شاہ صاحب نے اس شخص کو ہدایت کی کہ اب تم بیت اللہ کو چلے جاؤ اور باقی زندگی یادِ الٰہی میں گزار دو۔ چنانچہ آپ نے اُسے زادِ راہ دے کر روانہ فرما دیا۔

آکسیجن اور جسمانی نظام

موجودہ علمی اور سائنسی دور نے یہ بات معلوم کر لی ہے کہ انسان کو اگر کچھ وقفے کے لئے آکسیجن نہ ملے تو اس کے دماغ میں کام کرنے والے کھربوں خلیوں کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ سارا جسم آکسیجن کے اوپر قائم ہے اور سانس کی آمد و شد یا عمل تنفس ہوا سے آکسیجن حاصل کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔

ہوا ناک یا منہ کے ذریعے جسم میں کھنچی جاتی ہے اور آواز کے خانے (LARYNX) سے گزرتی ہوئی ہوا کی خاص نالی (TRACHEA) میں جاتی ہے اور پھر وہاں سے نالیوں کے ایک نازک نظام میں داخل ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے

ہوا آگے بڑھتی ہے اور ہوا کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے، ان نالیوں کا قطر بتدریج چھوٹا ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ہوا پھیپھڑوں کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے جہاں تقریباً تین سو ملین ہوا کی تھیلیوں سے گزر کر آکسیجن خون میں داخل ہو جاتی ہے۔ اگر ہوا کا دباؤ صحیح ہو اور آکسیجن کی مقدار بھی صحیح ہو تو پھر وہ آسانی سے ہوا کی تھیلیوں اور باریک رگوں کی جھلیوں میں سے ہو کر اندر پھیل جاتی ہے۔ جب ہم اندر سانس کھینچتے ہیں تو سینے کی خالی جگہ بڑی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہوا تیزی سے اندر چلی جاتی ہے پھر ہم جب سانس باہر نکالتے ہیں تو پھیپھڑوں کا لچک دار نظام ہوا کو باہر پھینک دیتا ہے۔

سانس لینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ جسم میں مناسب مقدار میں آکسیجن پہنچتی رہے تاکہ خلیوں میں ننھی ننھی انگیٹھیاں دہکتی رہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) خارج ہوتا رہے۔ انسان جب آرام کرتا ہے اس وقت وہ ایک منٹ میں دس سے سولہ بار تک سانس لیتا ہے اور تقریباً ایک پوائنٹ ہوا اندرونی جسمانی نظام میں داخل ہوتی رہتی ہے۔ جب آکسیجن کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے تو سانس لینے کی رفتار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ عام طور پر سانس کی رفتار اور گہرائی خود بخود دماغ کنٹرول کرتا رہتا ہے۔

قدرت نے انسان کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ وہ حسب ضرورت سانس میں تیزی یا کمی پیدا کر سکتا ہے۔ انسان اگر ذہنی طور پر صحت مند ہے تو بیشتر حالات میں اُسے اپنے سانس پر اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پیراکی کے دوران جب آدمی غوطہ لگا کر پانی کے نیچے چلا جاتا ہے تو اسے سانس

روکنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور یہ کام وہ آسانی کے ساتھ کر لیتا ہے۔ جب جمائی آتی ہے یا گہرا سانس لیا جاتا ہے تو اس سے سکون حاصل ہوتا ہے اور جب سانس کی نالی میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی ہے تو آدمی بے حد سراسیمہ ہو جاتا ہے اور اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی کا قیام سانس کے اوپر ہے۔ سانس جاری ہے تو زندگی برقرار ہے اور جب سانس کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

سانس کا تعلق آکسیجن کے اوپر ہے۔ آکسیجن کا ایک بڑا ذخیرہ دماغ کے ایک مخصوص حصّے میں جمع رہتا ہے۔ دماغ کا یہ وہی حصّہ ہے جو دل کی دھڑکن اور عملِ تنفس کو برقرار رکھتا ہے۔ فی الواقع انسان کی موت اس وقت واقع ہوتی ہے جب دماغ کے اندر آکسیجن کا پورا ذخیرہ ختم ہو جائے۔ دل کی حرکت بند ہو جانے سے اگر موت واقع ہو جائے اور دماغ کے اندر آکسیجن کا ذخیرہ موجود رہے تو اس عمل موت کو مرنا نہیں کہتے۔ طبی اصطلاح میں اسے "سکتہ" کہا جاتا ہے۔ یہ روزمرّہ مشاہدے کی بات ہے کہ بیمار کو نازک حالت میں آکسیجن دی جاتی ہے اور اس طرح بڑی سے بڑی بیماری پر عارضی طور پر سہی، مگر غلبہ حاصل کر لیا جاتا ہے۔ احسن الخالقین اللہ نے ہمارے پھیپھڑوں کی تخلیق کچھ اس طرح کی ہے کہ تمام جسم کا خون تین منٹ میں پھیپھڑوں کے راستے آکسیجن لے کر واپس جسم میں چلا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر تین منٹ کے بعد جسم میں دَور کرنے والا خون آکسیجن لینے کے لئے دوبارہ پھیپھڑوں میں آ جاتا ہے۔ ہم جب سانس اندر کھینچتے ہیں تو ہوا میں اکیس فی صد آکسیجن ہمارے اندر چلی جاتی ہے اور جب ہم سانس باہر نکالتے ہیں تو آکسیجن خرچ ہونے کے بعد تقریباً بارہ فی صد رہ جاتی ہے۔ مشق کے ذریعے اگر دماغ کے اندر آکسیجن کا ذخیرہ کیا جائے

اور رُوحانی طرزوں میں اس ذخیرے کو استعمال کرنے کا طریقہ بھی سیکھ لیا جائے تو اپنے ارادے اور اختیار سے دل کی دھڑکن اور عملِ تنفس کو بند کر کے آدمی مہینوں تک زندہ رہ سکتا ہے اور پھر اپنے ارادے اور اختیار سے دنوں، ہفتوں اور مہینوں کی عارضی موت سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

دوسو سال کی نیند

ایک بہروپیا تھا۔ ہمیشہ نیا بہروپ بنا کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تاکہ بادشاہ کو مغالطہ میں رکھ کر انعام میں گھوڑا اور جوڑا حاصل کرے۔ مگر بادشاہ اس کے بہروپ سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ بہروپیا ایک یوگی کے پاس گیا اور اس سے حبس دم (سانس پر کنٹرول حاصل کرنے کی مشق) سیکھا اور پھر یوگی بن کر اپنے شہر کے مضافات میں قیام کیا۔ ایک چھوٹا سا گنبد بنایا اور چند چیلے جمع کئے اور حبسِ دم کر کے بیٹھ گیا۔ اور گنبد کا دروازہ اس خیال سے بند کروا دیا کہ جب بادشاہ کو خبر ہوگی کہ ایک یوگی اتنی مدت سے گنبد میں بند ہے تو بادشاہ یہاں آ کر گنبد کھلوائے گا۔ چیلے مجھے حبس دم کے فارمولے کے مطابق زندہ کر دیں گے۔ اور میں گھوڑا اور جوڑا انعام میں لے لوں گا۔ خدا کی قدرت کہ چند روز میں انقلاب آگیا۔ نہ بادشاہ رہا نہ سلطنت رہی۔ شہر بھی برباد ہوگیا۔ چیلے مر کھپ گئے اور گنبد بند کا بند ہی رہا۔ دوسو سال کے بعد شہر دوبارہ آباد ہوا۔ کسی شخص نے یہ دیکھنے کے لئے کہ گنبد کے اندر کیا ہے، گنبد کو کھلوایا۔ دیکھا کہ گنبد کے اندر ایک صحیح وسالم پورے جسمانی خدوخال کے ساتھ آدمی مراقبہ میں بیٹھا ہے۔ لوگوں کا ہجوم ہوگیا۔ اس ہجوم میں ایک یوگی بھی تھا۔ اس نے مراقب شخص کو پہچان لیا اور حبس دم کے قاعدوں کے مطابق عمل کیا اور دل کی دھڑکن

شروع ہوگئی۔ ہوش و حواس بحال ہو گئے۔ جیسے ہی وہ آدمی ہوش و حواس میں آیا بولا، لاؤ میرا گھوڑا اور جوڑا۔ لوگ حیرت کے ساتھ ایک دوسرے کو تکنے لگے اور کہنے لگے یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ شخص کوئی پاگل ہے، مجنون ہے یا اس کو ہذیان یا خفقان ہو گیا ہے۔ اس بہروپئے نے کہا کہ میں نے حبس دم کا یہ عمل فلاں بادشاہ کے زمانے میں فقط گھوڑا اور جوڑا لینے کے لئے کیا تھا۔

سانس کے دو رُخ

تخلیقی فارمولوں کا علم رکھنے والے بندے یہ جانتے ہیں کہ کائنات اور کائنات کے اندر تمام مظاہرات کی تخلیق دو رُخ پر کی گئی ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں سانس کے دو رُخ متعین ہیں۔ ایک رُخ یہ ہے کہ آدمی اندر سانس لیتا ہے اور دوسرا رُخ یہ ہے کہ سانس باہر نکالا جاتا ہے۔ گہرائی میں سانس لینا صعودی حرکت ہے۔ اور سانس کا باہر آنا نزولی حرکت ہے۔ صعود اس حرکت کا نام ہے جس حرکت میں تخلیق کا ربط براہِ راست خالق کے ساتھ قائم ہے اور نزول اس حرکت کا نام ہے جس میں بندہ غیب سے دور ہو جاتا ہے اور ٹائم اسپیس کی گرفت اس کے اوپر مسلّط ہو جاتی ہے۔

جب کچھ نہ تھا، اللہ تھا۔ اللہ نے چاہا اور ساری کائنات تخلیق ہو گئی۔ کلیہ یہ بنا کہ تخلیق کی بنیاد اللہ کا چاہنا ہے۔ اللہ کا چاہنا اللہ کا ذہن ہے یعنی کائنات اور ہمارا اصل وجود اللہ کے ذہن میں ہے۔ قانون یہ ہے کہ شے کی وابستگی اصل سے برقرار نہ رہے تو وہ شے قائم نہیں رہتی۔ اس وابستگی کا قیام مظاہراتی خدوخال میں صعودی حرکت سے قائم ہے۔ اور صعودی حرکت اندر سانس لینا ہے۔

اس کے برعکس ہمارا جسمانی تشخص بھی ہے۔ اس جسمانی اور مادی تشخص کی بنا نزولی حرکت ہے۔

توانائی اور روح

کائنات اور اس کے اندر تمام مظاہرات ہر لمحہ اور ہر آن ایک سرکل میں سفر کر رہے ہیں اور کائنات میں ہر مظہر ایک دوسرے سے آشنا اور متعارف ہے۔ تعارف کا یہ سلسلہ خیالات پر مبنی ہے۔ سائنس نے آپس میں اس تبادلۂ خیال اور رشتہ کو توانائی کا نام دیا ہے۔ سائنس کی رُو سے کائنات کی کسی شے کو خواہ وہ مرئی (VISIBLE) ہو یا غیر مرئی (INVISIBLE) کلیتہً فنا نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مادّہ مختلف ڈائیوں میں نقل مکانی کر کے توانائی بن جاتا ہے اور توانائی روپ بدل بدل کر سامنے آتی رہتی ہے۔ مکمل موت کسی پر بھی وارد نہیں ہوتی۔ روحانیت میں اسی توانائی کو رُوح کا نام دیا گیا ہے۔ رُوح کو جو علم ودیعت کر دیا گیا ہے، وہی علم خیالات، تصوّرات اور احساسات بنتا ہے۔ یہ خیالات اور تصوّرات لہروں اور شعاعوں کے دوش پر ہمہ وقت، ہر آن اور ہر لمحہ مصروفِ سفر رہتے ہیں۔ اگر ہمارا ذہن ان لہروں کو پڑھنے اور ان کو حرکت دینے پر قدرت حاصل کر لے تو ہم کائنات کے تصویر خانوں میں خیالات کے ردّ و بدل سے وقوف حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک کائنات کی کُنہ سے ہم باخبر نہیں ہوں گے، کائنات کے قلب میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ کائنات اور آسمانی دنیا میں داخل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم سانس کے اس رُخ پر کنٹرول حاصل کر لیں جس رُخ پر صعودی حرکت کا قیام ہے۔

سانس کا گہرائی میں جانا لاشعور ہے اور سانس کا گہرائی سے مظاہراتی سطح پر آنا

شعور ہے۔ شعوری زندگی حرکت میں ہوتی ہے تو لاشعوری زندگی پردے میں چلی جاتی ہے اور لاشعوری زندگی میں شعوری حرکات مغلوب ہو جاتی ہیں۔ اس قانون سے باخبر ہونے کے لئے شعوری اور لاشعوری دونوں تحریکات کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ ذہن کی پراسرار قوتیں اسی وقت کام کرتی ہیں جب ذہن سانس کی صعودی حرکت کا احاطہ کرے۔ ایسا ہو جانے سے ہمارے اندر مرکزیت اور توجہ کی صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔

یاد رکھیے! ہمارے انر (INNER) میں نصب شدہ انٹینا (ANTENNA) اس وقت کچھ نشر کرنے یا قبول کرنے کے قابل ہوتا ہے جب ذہن میں توجہ اور مرکزیت کی صلاحیتیں وافر مقدار میں موجود ہوں۔ ان صلاحیتوں کا ذخیرہ اس وقت فعال اور متحرک ہوتا ہے جب ہم اپنی تمام تر توجہ، یکسوئی اور صلاحیتوں کے ساتھ صعودی حرکت میں ڈوب جائیں۔

زندگی میں سانس کا عمل دخل

ماورائی علوم سیکھنے کے لئے مضبوط اعصاب اور طاقتور دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اعصاب میں لچک پیدا کرنے، دماغ کو متحرک رکھنے اور قوت کارکردگی بڑھانے کے لئے سانس کی مشقیں بے حد مفید اور کارآمد ہیں۔ قلندر شعور کا مسافر جب سانس کی مشقوں پر کنٹرول حاصل کرلیتا ہے تو دماغ کے اندر ریشوں اور خلیوں کی حرکات اور عمل میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ انر (INNER) میں سانس روکنے سے دماغ کے خلیات چارج ہوجاتے ہیں جو انسان کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار ہونے، ابھرنے اور پھلنے پھولنے کے بہترین مواقع فراہم کرتے ہیں۔

ماہرین روحانیت نے سانس کی مشقوں کے قاعدے اور طریقے بنائے ہیں۔ اگر ان طریقوں پر عمل کیا جائے تو بہت سارے روحانی اور جسمانی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ زندگی کا دارومدار سانس کے اوپر ہے۔ انسانی زندگی میں وہم، خیال، تصوّر، ادراک، احساس سب اس وقت تک موجود ہیں جب تک سانس کا سلسلہ جاری ہے۔ سانس کے ذریعے ہی آدمی کے اندر صحت بخش لہریں منتقل ہوتی ہیں اور سانس کے ذریعے ہی آدمی فضا میں پھیلی ہوئی کثافت، دھواں اور گرد و غبار سے بیمار ہوجاتا ہے۔ صاف اور کھلی فضا میں بیٹھ کر سانس اندر لیتے وقت اگر یہ تصوّر کیا جائے کہ فضا میں سے صحت اور توانائی کی لہریں میرے اندر

جارہی ہیں اور جسم میں جذب ہو رہی ہیں تو واقعتاً ایسا ہی ہوجاتا ہے۔ سانس کی مخصوص مشقیں دراصل دورانِ خون کو تیز کرتی ہیں۔ دماغی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں اور برانگیختہ جذبات کو ٹھنڈا کرتی ہیں۔ اور کسی بہت عمدہ مصفّیِ خون دوا کی طرح خون کو صاف کرتی ہیں۔ سانس کی مشقوں سے آدمی تقریباً اپنی ہر بیماری کا علاج کرسکتا ہے مثلاً نسیان کا مرض، پیٹ کے جملہ امراض، معدے اور آنتوں میں السر، قبض، سنگ رہنی، نزلہ زکام، سردرد، مرگی اور دوسرے قسم کے دماغی دورے، بینائی کی کمزوری وغیرہ وغیرہ۔ سانس کی مشقوں کو علاج کے قاعدوں کے مطابق اگر پابندیٔ وقت کے ساتھ انجام دیا جائے تو سینہ، گلے، ناک وغیرہ کے امراض بھی از خود ختم ہوجاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ساٹھ ستر سال کے بوڑھے لوگ جنہوں نے سانس کی کسی منتخب مشق کو اپنا معمول بنالیا ہے، ہشاش بشاش اور نوجوانوں کی طرح تر و تازہ رہتے ہیں۔ آخری وقت میں ان کی کھال جھرّیوں سے محفوظ رہتی ہے۔ پژمردگی اور افسردگی ان کے قریب نہیں پھٹکتی۔ جو حضرات استاد کی نگرانی میں سانس کی مشق پابندیٔ وقت کے ساتھ کرتے ہیں، ان کے اندر انتقالِ خیال (TELEPATHY) کی ایسی قوت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ دور دراز فاصلوں پر اپنے احکامات پہنچا دیتے ہیں۔ میرا اپنا ایک ذاتی واقعہ سنیئے۔ قلندر شعور کے بانی قلندر بابا اولیاءؒ کی نگرانی میں سانس کی مشق کے دوران ایک روز مجھے یہ خیال آیا کہ جب زندگی کا دارومدار سانس کے اوپر ہے اور زمین پر موجود ہر چیز روشنیوں کے تانے بانے (AURA) میں بند ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ آدمی آٹا گوندھے، روٹی پکائے اور کھانے کا تکلف کرے۔ یہ خیال ہر روز سورج طلوع ہونے کے وقت گہرا ہوتا چلا گیا۔

روشنیوں سے تیار کئے ہوئے کھانے

ایک روز جب میں سورج طلوع ہونے سے پہلے مشرق کی طرف منہ کئے سانس کی مشق کر رہا تھا تو دماغ میں ایک دریچہ کھلا اور اس دریچہ میں یہ خیال وارد ہوا کہ فضا میں سے وہ روشنیاں اور وہ عناصر جس سے چنے تخلیق ہوتے ہیں میرے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ میں نے جسم مثالی (AURA) کی آنکھ سے یہ دیکھا کہ میرے سامنے بہت عمدہ قسم کے چنے رکھے ہوئے ہیں اور میرا جسم مثالی ان چنوں کو کھا رہا ہے۔ دوسرے دن میرے اندر سیب کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ پھر دماغ میں ایک دریچہ کھلا اور فضا میں پھیلی ہوئی وہ روشنیاں جو سیب تشکیل کرتی ہیں ایک جگہ مجتمع ہو کر سیب بن گئیں اور میں نے سیب کھا لئے۔ القصہ مختصر خورد و نوش کا یہ سلسلہ متواتر سترہ روز تک قائم رہا۔ ان سترہ دنوں میں کھانے پینے کی کسی چیز کی طرف میرا ذہن متوجہ نہیں ہوا۔ جس چیز کو میرا دل چاہتا تھا یا جسمانی اعتبار سے میرے اندر انرجی ذخیرہ کرنے کا تقاضا پیدا ہوتا تھا میں سانس کے ذریعے اس انرجی کو اپنے اندر منتقل کر لیتا تھا۔ فضائے بسیط میں پھیلی ہوئی ان روشنیوں کے کھانے پینے کے اس عمل سے میرے اندر قلندر شعور کی آنکھ اس قدر طاقتور ہو گئی تھی کہ پتھر اور اینٹ کی دیواریں باریک کاغذ کی طرح نظر آتی تھیں۔ دور پرے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ جو شخص سامنے آتا تھا اس کی سوچ اور اس کے خیالات میرے ذہن کی اسکرین پر منتقل ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں بڑے ہی عجیب تجربات ہوئے۔ جو شخص صورت سے پرہیزگار تھا۔ اس کے خیالات کی کثافت سے دماغ متعفن ہو جاتا تھا اور جو شخص شکل و صورت کے اعتبار سے زاہد اور متقی نہیں تھا

اس کے خیالات کی روشنیاں، ہلکی اور معطر محسوس ہوتی تھی۔ عجائبات کی ایک دنیا روشن ہو گئی تھی۔

روشنیوں کے گودام

جس طرح سانس کی مشقوں کے ذریعے شعوری یا جسمانی نظام طاقت ور ہوتا ہے اسی طرح صعودی سانس کے ذریعے انسان کی روح میں انوار کے ایسے ذخیرے جمع ہو جاتے ہیں جن ذخیروں سے آدمی فکشن (FICTION) اور مفروضہ حواس سے نکل کر حقیقی دنیا (غیب کی دنیا) میں پہنچ جاتا ہے۔ سانس کی مشق سے انسان کے اندر ذخیرہ کرنے والے موجود چھ اسٹور نور، روشنی اور انرجی سے معمور ہو جاتے ہیں۔ روح کے اندر یہ چھ اسٹور مختلف مقامات پر ہیں۔ اور ان گوداموں میں جو روشنیاں جمع ہوتی ہیں ان کے رنگ مختلف ہیں۔

پہلے گودام میں زرد رنگ کی روشنیاں، دوسرے میں سرخ رنگ، تیسرے میں سفید رنگ اور چوتھے میں سبز رنگ، پانچویں میں نیلا رنگ اور چھٹے میں بنفشی رنگ کی روشنیاں جمع ہیں۔ ان رنگوں کے ملاپ (COMBINATION) سے بہت سارے رنگ بنتے ہیں۔ یہ رنگ دراصل زندگی میں کام آنے والے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔

رنگین شعاعیں

حد نگاہ سے زمین کی طرف آئیے تو آپ کو نیلے رنگ کی لاتعداد رنگین شعاعیں ملیں گی۔ رنگ کا جو منظر ہمیں نظر آتا ہے اس میں روشنی، آکسیجن گیس، نائٹروجن گیس اور قدرے دیگر گیس بھی شامل ہوتی ہیں۔ ان گیسوں کے علاوہ کچھ سائے (SHADES) بھی ہوتے ہیں جو ہلکے ہوتے ہیں یا تیز، کچھ اور بھی اجزاء اسی طرح آسمانی رنگ میں شامل ہو جاتے ہیں جس سے فضا

میں ہمیں رنگ کا فرق نظر آتا ہے۔ اس فضا میں نگاہ اور حدِ نگاہ کے درمیان ، باوجود مطلع صاف ہونے کے بہت کچھ موجود ہے۔

اوّل ہم ان روشنیوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو خاص طور پر آسمانی رنگ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ روشنیوں کا سرچشمہ کیا ہے اس کا بالکل صحیح علم انسان کو نہیں ہے۔ قوسِ قزح کا جو فاصلہ بیان کیا جاتا ہے وہ زمین سے تقریباً نو کروڑ میل ہے مطلب یہ ہوا کہ جو رنگ ہمیں اتنے قریب نظر آتے ہیں وہ نو کروڑ میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اب یہ سمجھنا مشکل کام ہے کہ سورج کے اور زمین کے درمیان علاوہ کرنوں کے اور کیا کیا چیزیں موجود ہیں۔ جو فضا میں تحلیل ہوتی رہتی ہیں۔

جو کرنیں سورج سے ہم تک منتقل ہوتی رہتی ہیں ان کا چھوٹے سے چھوٹا جزو فوٹان (PHOTON) کہلاتا ہے اور اس فوٹان کا ایک وصف یہ ہے کہ اس میں اسپیس نہیں ہوتا۔ اس لئے جب یہ کرنوں کی شکل میں پھیلتے ہیں تو نہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں نہ ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ جگہ نہیں روکتے اس وقت تک جب تک کہ دوسرے رنگ سے نہ ٹکرائیں۔

فضا میں جس قدر عناصر موجود ہیں ان میں سے کسی عنصر سے فوٹان کا ٹکراؤ ہی اسے اسپیس دیتا ہے۔ دراصل یہ فضا کیا ہے؟ رنگوں کی تقسیم ہے۔ رنگوں کی تقسیم جس طرح ہوتی ہے وہ اکیلے فوٹان کی رُو سے نہیں ہوتی بلکہ ان حلقوں سے ہوتی ہے جو خود فوٹان بنتے ہیں۔ جب فوٹانوں کا ان حلقوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو اسپیس یا رنگ وغیرہ کئی چیزیں بن جاتی ہیں۔

کرنوں میں حلقے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کرنوں میں یہ حلقے کیسے پڑے۔ ہمیں تو

یہ علم ہے کہ ہمارے کہکشانی نظام میں بہت سے اسٹار یعنی سورج ہیں وہ کہیں نہ کہیں سے روشنی لاتے ہیں۔ ان کا درمیانی فاصلہ کم سے کم پانچ نوری سال بتایا جاتا ہے۔ جہاں ان کی روشنیاں آپس میں ٹکراتی ہیں ، وہ روشنیاں حلقے بنا دیتی ہیں جیسے ہماری زمین یا اور سیارے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج سے یا کسی اور اسٹار سے جن کی تعداد ہمارے کہکشانی نظام میں دو کھرب بتائی جاتی ہے ان کی روشنیاں سنکھوں کی تعداد پر مشتمل ہیں۔ اور جہاں ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے وہیں ایک حلقہ بن جاتا ہے جسے سیارہ کہتے ہیں۔

برقی رو کیمرہ

دماغ میں کھربوں خانے ہوتے ہیں اور ان میں سے برقی رَو گزرتی رہتی ہے۔ اسی برقی رَو کے ذریعے خیالات ، شعور ، لاشعور اور تحت الشعور سے گزرتے رہتے ہیں۔ دماغ کا ایک خانہ وہ ہے جس میں برقی رَو فوٹو لیتی رہتی ہے اور تقسیم کرتی رہتی ہے۔ یہ فوٹو بہت ہی زیادہ تاریک ہوتا ہے یا بہت ہی چمک دار۔

ایک دوسرا خانہ ہے جس میں کچھ اہم باتیں ہوتی ہیں لیکن وہ اتنی اہم نہیں ہوتیں کہ سالہا سال گزرنے کے بعد بھی یاد آجائیں۔ ایک تیسرا خانہ اس سے زیادہ اہم باتوں کو جذب کر لیتا ہے۔ وہ بشرطِ موقع کبھی کبھی یاد آجاتی ہیں۔ ایک چوتھا خانہ معمولات کا ہے جس کے ذریعے آدمی عمل کرتا ہے لیکن اس میں ارادہ شامل نہیں ہوتا۔ پانچواں خانہ وہ ہے جس میں گزری ہوئی باتیں اچانک یاد آجاتی ہیں جن کا زندگی کے تار و پود سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک چھٹا خانہ ایسا ہوتا ہے جس کی یا تو کوئی بات یاد نہیں آتی اور اگر یاد آتی ہے تو فوراً اس کے ساتھ ہی عمل

ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی پرندے کا خیال آیا۔ خیال آتے ہی عملاً وہ پرندہ سامنے ہے۔ ساتواں خانہ اور ہے جس کو عام اصطلاح میں "حافظہ" (MEMORY) کہتے ہیں۔

دماغ میں مخلوط آسمانی رنگ آنے سے اور پیوست ہونے سے خیالات، کیفیات، محسوسات وغیرہ برابر بدلتے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ انسان ان خیالات کو ملانا سیکھ لیتا ہے۔ ان میں سے جن خیالات کو بالکل کاٹ دیتا ہے وہ حذف ہو جاتے ہیں اور جو جذب کر لیتا ہے وہ عمل بن جاتے ہیں۔ ان رنگوں کے سائے ہلکے، بھاری یعنی طرح طرح کے اپنا اثر کم و بیش پیدا کرتے ہیں اور فوراً اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں تاکہ دوسرے سائے ان کی جگہ لے سکیں۔ بہت سے سائے جنہوں نے جگہ چھوڑ دی ہے محسوسات بن جاتے ہیں، اس لئے کہ وہ گہرے ہوتے ہیں۔

اعصابی نظام

ہماری تمام اندرونی و بیرونی حرکات کو اعصابی نظام کنٹرول کرتا ہے۔ اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اعصابی نظام میں دماغ اور حرام مغز کے علاوہ ہمارے جسم میں اعصاب کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اعصاب کا کردار بہت اہم ہے کیوں کہ ان ہی کے ذریعے جسم کے مختلف پیغامات دماغ اور حرام مغز تک پہنچتے ہیں۔ اور ہم یہ جان لیتے ہیں کہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں، کیا سُن رہے ہیں اور کیا محسوس کر رہے ہیں۔

اعصابی نظام کا مرکزی کردار دماغ ہے جو کھوپڑی کے اندر بند ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ دماغ کا سب سے بڑا حصہ جو تقریباً پانچ سینٹی میٹر گہرے مرکزی شگاف سے دو نصف کُروں میں تقسیم ہے۔ ان کُروں کو ہم دایاں دماغ اور بایاں دماغ کہتے ہیں۔ دایاں

دماغ جسم کے بائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے اور بایاں دماغ جسم کے دائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے۔

دماغ کی اُوپری سطح ایک ہلکے سُرمئی رنگ کے مادے کی تہ ہوتی ہے اور اس کے نیچے ایک سفید رنگ کا دبیز حصہ ہوتا ہے۔ سفید دماغ سوچ بچار، تفکر، غور و فکر کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہلکے سرمئی رنگ کا دماغ وہ جگہ ہے جہاں پر تمام جسم سے پیغامات آتے ہیں اور یہیں سے مختلف پیغامات جسم کو واپس بھیجے جاتے ہیں۔ یہ جسم کے عضلات کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھ، کان، ناک کی حسّوں کے مراکز بھی اسی دماغ میں ہوتے ہیں۔

دماغ کا پچھلا حصہ (MEDULA OBLONGATA) دل کی دھڑکن کو کنٹرول کرتا ہے۔ یوگی حبس دم کی مشقوں کے ذریعے اس بات پر کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں کہ میڈولا میں آکسیجن کی کثیر مقدار ذخیرہ کر کے طویل عرصے تک بغیر سانس لئے زندہ رہ سکیں۔ وہ کئی کئی سالوں تک مردہ رہ کر دوبارہ جی اُٹھتے ہیں۔ حرام مغز اعصابی نسیجوں کا مجموعہ ہے جو کہ ایک لمبی ڈوری کی شکل میں ریڑھ کی ہڈی کے سوراخ میں واقع ہے۔ یہ دماغ اور جسم کے درمیان رابطہ قائم رکھتا ہے اور جسم کو تمام پیغامات کی تقسیم حرام مغز کے ذریعے ہوتی ہے۔

دل کے دھڑکنے پھیلنے اور سکڑنے کا عمل برقی رَو پر قائم ہے۔ بجلی کی لہریں دل کو پھیلاتی اور سکیڑتی رہتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے کسی مشین کو چلانے کے لئے برقی رَو کام کرتی ہے۔

اس طرح ہمارا پورا جسمانی نظام اعصاب کے تانے بانے سے مرکب ہے جس

میں برقی رَو یا ایکٹرسٹی دوڑتی رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہمارا جسمانی نظام برقی رَو یا روشنی پر قائم ہے اور یہ سارا نظام روشنی سے فیڈ ہوتا رہتا ہے۔

مُراقبہ

مراقبہ کی تشریح کرتے ہوئے قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس میں انسان دنیاوی حالات وواقعات اور دنیاوی، دلچسپیوں اور زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوجاتا ہے۔ غیب کی دنیا میں داخل ہونا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان زمان ومکان سے آزاد نہ ہو یعنی جسمانی گوشت پوست اور جسمانی تقاضوں سے جب تک کوئی آدمی ذہنی طور پر یکسو نہیں ہوتا۔ غیب کی دنیا میں داخل نہیں ہوسکتا۔ جسمانی تقاضے سے آزاد ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کے اُوپر موت وارد ہوجائے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان جسمانی تقاضوں کو ثانوی حیثیت دے دے اور جہاں سے جسمانی تقاضے روشنی کی شکل میں نزول کر رہے ہیں اُن کی طرف متوجہ ہوجائے۔

مراقبے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی کسی تاریک گوشے میں جہاں گرمی سردی معمول سے زیادہ نہ ہو، آرام دہ نشست کے ساتھ بیٹھ جائے۔ ہاتھ۔ پیر دل اور جسم کے تمام اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دے۔ اور اپنے اوپر ایسی کیفیت طاری کرے جس کیفیت میں جسم کی موجودگی کی طرف سے ذہن ہٹ جائے۔ سانس گہرائی میں لیا جائے۔ گہرائی میں سانس لینے سے سانس کی رفتار میں ٹھہراؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ آنکھیں بند کرلی جائیں اور بند آنکھوں سے اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کی جائے۔ خیالات اور عمل پاکیزہ ہوں۔ خیالات اور عمل کی پاکیزگی یہ ہے کہ کسی کو بُرا نہ سمجھے۔ کسی کی طرف سے بغض وعناد نہ رکھے اگر کسی سے تکلیف پہنچی ہے تو انتقام نہ لے اور معاف کردے۔ ضروریاتِ زندگی اور معاش کے حصول میں اعضا کا وظیفہ پورا کرے۔ جدوجہد میں کوتاہی نہ کرے لیکن نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے۔ کسی عمل سے یہ محسوس ہوجائے کہ مجھ سے کسی کی دل آزاری ہوگئی ہے یا کسی کے ساتھ زیادتی ہوگئی ہے تو بلاتخصیص وہ کمزور ہو، ناتواں ہو، غریب ہو، چھوٹا ہو یا بڑا ہو اُس سے معافی مانگ لی جائے۔ آدمی جو کچھ اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ دوسروں کے لئے بھی پسند کرے۔ ذہن کے اندر مال ومتاع اور اسباب کی اہمیت نہ ہو۔ اللہ کے پھیلائے ہوئے اور دیئے ہوئے وسائل کو خوش ہوکر استعمال کرے لیکن دنیاوی وسائل کو مقصدِ زندگی نہ بنائے۔ جس طرح ممکن ہو دامے، درمے، قدمے، سخنے اللہ کی مخلوق کی خدمت کی جائے۔

جس شخص کے اندر پاکیزہ خیالات، پاکیزہ اوصاف موجود ہوتے ہیں، مراقبے کے عمل سے اس کا لطیفۂ نفسی (لطائف کا ذکر اس کتاب کے پچھلے اسباق میں تفصیل سے آچکا ہے) جلد رنگین ہوجاتا ہے۔ لطیفۂ نفسی کے رنگین ہوجانے سے شعور کے اندر جِلا پیدا ہوجاتی ہے۔ شعور کا آئینہ شفاف ہوجاتا ہے۔

مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس عمل میں روحانی استاد یا اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ سالک یا روحانی شاگرد کے اندر اگر چوں چرا ہے اور تعمیل نہیں ہے تو مراقبے کا عمل پورا نہیں ہوتا۔ مراقبے میں کامیابی کے لئے اور مراقبے کا صحیح نتیجہ مرتب ہونے کے لئے خود سپردگی ضروری ہے۔

مراقبے کے ذریعے انسان عالمِ ظاہر کی طرح عالمِ باطن کی دنیا سے روشناس ہوتا ہے۔ جب سالک غیب کی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے تو جس طرح وہ عالمِ ناسوت یا اس دنیا میں زندگی گزارتا ہے اور زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اسی طرح وہ

غیب کی دنیا میں نظامِ شمسی اور بے شمار افلاک کو دیکھتا ہے۔ فرشتوں سے متعارف ہوتا ہے۔ ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کے سامنے وہ تمام حقائق آجاتے ہیں جن حقائق پر یہ کائنات تخلیق ہوئی ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ کائنات کی ساخت میں کس قسم کی روشنیاں بر سرِ عمل ہیں۔ ان روشنیوں کا منبع (SOURCE) کیا ہے۔ یہ روشنیاں کس طرح تخلیق ہو رہی ہیں، افرادِ کائنات میں کس طرح تقسیم ہو رہی ہیں اور روشنیوں کی مقداروں کی رد و بدل سے کائنات کے نقوش کس طرح بن رہے ہیں۔ سالک کی آنکھ یہ بھی دیکھ لیتی ہے کہ روشنیوں کا منبع انوار ہیں۔ پھر اس پر وہ تجلی بھی منکشف ہو جاتی ہے جو روشنیوں کو سنبھالنے والے انوار کی اصل ہے۔

بانیٔ قلندر شعور، قلندر بابا اولیاءؒ نے مراقبہ کا ایک مربوط نظام قائم کیا ہے۔ جس طرح کسی بھی علم کو سیکھنے کے لئے شاگرد استاد کی سرپرستی میں الف، ب، پ، ت پڑھتا ہے، پھر جملے بنانا سیکھتا ہے اور اس کے بعد بڑی بڑی کتابیں پڑھنا اس کے لئے معمول بن جاتا ہے اسی طرح ماورائی علوم سیکھنے کے لئے رُوحانی اُستاد کی سرپرستی ضروری ہے۔

بین الاقوامی تنظیم "قلندر شعور" نے درس و تدریس کے لئے اوپن یونیورسٹی کی بنیاد پر اسباق اور مراقبوں کا ایک نصاب تیار کیا ہے۔ دنیا میں کسی بھی مقام پر موجود ماورائی علوم سیکھنے کے خواہشمند حضرات مندرجہ ذیل پتوں پر رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

مرکزی مراقبہ ہال
سرجانی ٹاؤن، نزد کے۔ ڈی۔ اے آفس
پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۸۰
کراچی - پاکستان

MURAQBA HALL
414, LOWER BROUGHTON
ROAD, SALFORD, M-7-9FU
TEL: 061-792-5995

تذکرہ

قلندر بابا اولیاءؒ



مؤلفہ شمس الدین عظیمی

یہ تذکرہ ہے اس بات سے متعلق کہ اولیاء اللہ کی طرزِ فکر کیا ہوتی ہے اور وہ کون سے علوم ہیں جن سے کشف و کرامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں سلسلہ عظیمیہ کے امام ابدالِ حق قلندر بابا اولیاءؒ کی تعلیمات، شجرہ، اُن سے صادر ہونے والی کرامات اور سلسلہ عظیمیہ کے اغراض و مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔

کتاب تذکرہ قلندر بابا اولیاءؒ" اتنے سادہ اور دلنشیں انداز میں لکھی گئی ہے کہ کتاب شروع کرنے کے بعد آدمی پوری کتاب پڑھ لینا چاہتا ہے۔

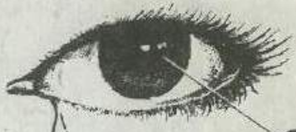
مختصر فہرست

قلندر کسے کہتے ہیں، روحانی تربیت، بیعت،
مقامِ ولادت، نسبتِ فیضان، دربارِ رسالت میں حاضری۔

کشف و کرامات:

کبوتر زندہ ہو گیا، گونگی لڑکی بولنے لگی،
بھوک لگی مچھلی آ گئی، فرشتے کیسے ہوتے ہیں،
پسینہ میں مشک کی خوشبو، جنگل اور جنگلی کبوتر،
ہر شئے میں اللہ نظر آتا ہے، زمین پر بٹھا دو، جوڑوں میں درد غائب، جن مرد اور جن عورتیں،
خواجہ غریب نوازؒ، بو علی شاہ قلندرؒ، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے جسمانی ملاقات،
درخت بھی باتیں کرتے ہیں،
لعل شہباز قلندرؒ کی رُوح سے باتیں۔
سنّے کا نمبر، صاحبِ خدمت بزرگ،
نیلم کی انگوٹھی، ایک لاکھ روپے خرچ ہو گئے۔
قلندرؒ کی نماز، علم لدنی کیا ہے، مستقبل کا انکشاف۔
اولیاء اللہ کے چالیس جسم ہوتے ہیں،
جسم مثالی کسے کہتے ہیں، آپریشن سے نجات۔
رسولی کا علاج، پولیو کا علاج،
پانی کا قطرہ موتی کیسے بن گیا،
اِن کے علاوہ اور متعدد عنوانات،

مکتبہ تاج الدین بابا، پوسٹ بکس ۲۲۱۳، ناظم آباد، کراچی ۱۸



ٹیلی پیتھی سیکھئے

اپنے ماورائی دماغ (COMPUTER) سے کام لے کر مصائب و مشکلات، پریشاں حالی اور دوسرے بے شمار گھریلو مسائل سے نجات پایئے۔



ہر انسان کا دماغ قدرت کا بنایا ہوا ایک کمپیوٹر ہے۔ اس کمپیوٹر میں دو کھرب سے زیادہ آلات ہیں۔ جب ہم اپنے اندر اس کمپیوٹر کو چلانا سیکھ لیتے ہیں تو ہماری آنکھ خلا کے اُس پار دیکھنے لگتی ہے۔ ہم دُور دراز فاصلوں پر اپنے دوستوں، اپنے عزیزوں اور اپنے پیاروں کو پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ اور اُن کے پیغامات سُن سکتے ہیں۔

عظیم روحانی سائنس داں قلندر بابا اولیاءؒ کے شاگردِ رشید خواجہ شمس الدین عظیمی نے روحانی، سائنسی برقی اور مقناطیسی ELECTROMAGNETIC تجربات اور فارمولوں پر ایک کتاب مرتب کی ہے۔ کتاب "ٹیلی پیتھی سیکھئے" پڑھ کر پُرسکون زندگی گزاریئے۔ خوش رہیئے اور دوسروں کو غم و آلام سے نجات دلایئے۔

قیمت: ۳۵ روپے

مکتبہ روحانی ڈائجسٹ، ناظم آباد، کراچی ۱۸